باب10

عدالتی خدمات
(سپریم کورٹ)

تقرری بطور جج سپریم کورٹ

سردار سید محمد خان مرحوم چیف جسٹس سپریم کورٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد مرحوم محمد یونس سرکھوی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے جس وجہ سے سپریم کورٹ میں ایک اسامی خالی ہوئی۔ اس وقت چوں کہ فوجیوں کا بہت عمل دخل تھا، مجھے کہلوایا گیا کہ میں بطور چیف جسٹس ہائی کورٹ ہی کام کروں۔لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میرے کرنے کے لیے ہائی کورٹ میں اور کوئی کام نہیں رہا ہے جبکہ میرے بعد کے کولیگز کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ بھی چیف جسٹس کی پوزیشن حاصل کریں۔ چوہدری محمد تاج صاحب جو اس وقت ایڈہاک جج سپریم کورٹ تھے، نے 2005 میں ہی ریٹائر ہونا تھا۔ میری خواہش تھی کہ ان کو چیف جسٹس بنایا جائے لیکن وہ پس پردہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ ان کو سپریم کورٹ کا جج بنایا جائے۔ جبکہ وہ مجھے باور کرا رہے تھے کہ ان کے جج سپریم کورٹ بننے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اس کا راز اس طرح کھلا کہ ایک روز مجھے پشاور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس ابن علی نے فون کر کے

جسٹس چوہدری محمد تاج صاحب کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔ میں نے ان کی تعریف کی اور سبب پوچھا' جس پر انہوں نے اس وقت کے کشمیر افیئرز کے منسٹر حیات محمد خان شیر پاؤ کے حوالے سے کہا کہ تاج صاحب سپریم کورٹ کا جج بننے کے لیے ان کو ملے تھے اور میرے بارے میں کوئی کاغذات بھی پیش کیے تھے کہ میں سپریم کورٹ میں نہیں جانا چاہتا۔ اس پر میں نے ان کو کہا کہ ایسی بات نہیں، میں سنیارٹی اور اپنی خواہش کی بنا پر سپریم کورٹ جانا چاہتا ہوں۔

میں جولائی 2004 میں پاکستان انگلستان' جوڈیشل کانفرنس میں شرکت کے لیے 18 جولائی کو لندن روانہ ہوا۔ میری اہلیہ بھی میرے ہمراہ تھیں۔ میں نے Schengin States کا ویزا بھی لیا تھا تا کہ سارے یورپ کی سیر کر سکوں۔ میری عدم موجودگی میں میری سپریم کورٹ میں جج کے طور پر تقرری کی گئی اور ریاض اختر چوہدری صاحب کو ہائی کورٹ کا پہلے ایکٹنگ اور پھر مستقل چیف جسٹس مقرر کیا گیا جبکہ اس وقت سینئر موسٹ جج چوہدری محمد تاج تھے۔ ریاض اختر کی تقرری اس وقت آزاد کشمیر کے صدر سردار انور مقامی حساس اداروں اور مرکز میں چوہدری شجاعت حسین کے وزیر اعظم ہونے کی وجہ سے ممکن ہوئی جو خود بھی جاٹ تھے۔ صدر ریاست سردار انور صاحب نے ریاض اختر اور ایجنسیوں کی ملی بھگت سے آزاد کشمیر کی عدلیہ کی اعلیٰ روایات کو پامال کرنے کی بنیاد ڈالی جس کے بعد راجہ ذوالقرنین صاحب نے بطور صدر ایجنسیوں سے مل کر 2006 میں پہلی روایت دہرا کر انتہا کر دی۔ یہ آزاد کشمیر کی عدالتی نظام، آئین اور نظام کے ساتھ حکومت پاکستان کا سب سے بڑا مذاق تھا بلکہ المیہ تھا کہ آئینی روایات کے خلاف محض چاپلوسی اور چمک کی بنا پر سنیاریٹی کے اصول کو پامال کیا گیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ چوہدری تاج صاحب نے خوشی خوشی یہ فیصلہ قبول کر لیا اور اس پر کوئی احتجاج، کوئی مزاحمت یا ندامت نہیں کی۔ عام لوگوں نے بھی اس کو برا نہیں کہا۔ ریاض اختر صاحب نے چیف جسٹس ہائی کورٹ بننے کے بعد چوہدری تاج صاحب کو سپریم کورٹ سے واپس ہائی کورٹ میں تضحیک کے طور پر منگوایا جو وہاں سے چند ماہ بعد ریٹائر ہو گئے۔ یہ آزاد کشمیر کی جیوڈیشری میں تباہی کی بنیاد بنی اور اس کی مکمل ذمہ داری اس وقت کے آزاد کشمیر کے صدر جنرل ریٹائرڈ سردار محمد انور خان پر ہے۔

ریاض اختر اور اس وقت کے صدر جنرل انور صاحب کے اصرار پر مجھے یورپ کا دورہ مختصر کر کے واپس آنا پڑا تا کہ میں سپریم کورٹ کے جج کے طور حلف لوں جس کے بعد ریاض اختر صاحب مستقل چیف جسٹس ہائی کورٹ بن سکیں۔ مجھے ریاض صاحب نے پیشکش کی کہ وہ میرے واپس آنے اور دوبارہ جانے کے سارے اخراجات دیں گے لیکن میں نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ چنانچہ میں معہ بیگم 18 اگست کو واپس آ گیا اور 20 اگست 2004 کو میں نے سپریم کورٹ کے مستقل جج کے طور حلف لیا۔ اس پر ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کی اسامی مستقل طور خالی ہوگئی جس کے خلاف جسٹس ریاض اختر چوہدری کی مستقل تقرری ہوگئی۔ اگر چوہدری تاج صاحب اس وقت احتجاجاً استعفیٰ دے دیتے یا احتجاج کرتے، ان کی اور ادارے کی عزت بحال ہو جاتی اور اس کے بعد یہ تاریخ میرے ساتھ نہ دہرائی جاتی۔

سپریم کورٹ میں اس وقت مرحوم یونس سرکھوی چیف جسٹس تھے۔ یہ بہت نفیس انسان تھے۔ ان کے میرے ساتھ اچھے تعلقات تھے جبکہ خواجہ سعید صاحب دوسرے جج تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یعنی 13 اکتوبر 2004 میں ہندوستانی ویزا پر معہ بیگم کے ہوائی جہاز کے زریعہ براستہ لاہور، دہلی، سرینگر کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں لاہور ایئر پورٹ پر بورڈنگ کر رہا تھا کہ جسٹس غلام مصطفیٰ مغل نے فون پر اطلاع دی کہ یونس سرکھوی صاحب دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ اب میرے لیے واپس آنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی، اس لیے میں دہلی کے لیے روانہ ہو گیا لیکن دل بہت افسردہ ہوا۔ اس دورہ کی تفصیل الگ موضوع کے طور پر درج ہے۔ سرکھوی صاحب کے فوت ہونے کے بعد خواجہ سعید صاحب، جو سینئر موسٹ جج تھے، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مقرر کیے گئے جو ان کا حق تھا۔

میرے سرینگر قیام کے دوران ایک روز میں سرینگر یونیورسٹی کی ایک تقریب میں تھا کہ مجھے عمر محمود قصوری ایڈووکیٹ جو کہ کشمیر کونسل کے قانونی مشیر تھے اور ریاض اختر چوہدری صاحب کا فون آیا کہ میں فوری وطن واپس چلا آؤں کیوں کہ حکومت پاکستان مجھے چیف جسٹس سپریم کورٹ بنانا چاہتی

ہے۔ میں نے بصد شکریہ ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا جس کا کوئی آئینی، قانونی اور اخلاقی جواز نہ ہو اور نہ ہی میں ریاض اختر کی طرح کی تاریخ دہرا سکتا ہوں۔ اگر اس وقت میں نے ایسا کیا ہوتا تو اس عمل کی عام لوگوں کے پاس یقینا مقبولیت ہوتی، لیکن زندگی بھر اپنے ضمیر کا مجرم ہو جاتا۔ انسان کو کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ اور وقت سے پہلے کسی چیز کی خواہش نہیں کرنی چاہیے جو بالآخر پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے مقدر جو لکھا ہے، اس میں اگر انسان کی کوشش شامل رہے تو ضرور مل جاتا ہے۔

جنرل مشرف کی کشمیر لیگل کمیٹی

جنرل پرویز مشرف نے ہندوستان کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اور چار نکاتی فارمولہ کے حوالہ سے Legal Committee on Kashmir کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا سربراہ وزیر اعظم پاکستان اور ممبران میں وزیر خارجہ، وزیر داخلہ، شریف الدین پیرزادہ خصوصی مشیر، سابق وزیر خارجہ انعام الحق، سیکریٹری قانون، سیکریٹری خارجہ شامل تھے اور آزاد کشمیر سے مجھے اس کا رکن مقرر کیا گیا۔ اس کی پہلی میٹنگ میں، میں نے وزیر اعظم پاکستان شوکت عزیز کی صدارت میں وزیر اعظم ہاؤس اسلام آباد میں مورخہ 11 فروری 2006 کو شرکت کی۔ کمیٹی کو وزیر اعظم پاکستان نے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کیا اور احمر بلال صوفی ایڈووکیٹ (نگران وزیر قانون) جو اس کمیٹی کے ممبر تھے، نے بھی آگاہ کیا جو غالباً آئی ایس آئی کی جانب سے ممبر نامزد تھے۔ میری نامزدگی صدر پاکستان نے خود کی تھی اور کسی ممبر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سوائے سرکاری ممبران کے باقی کس کے نامزد تھے۔ زیادہ کردار اس میں احمر بلال ایڈووکیٹ اور شریف الدین پیرزادہ صاحب کا تھا۔ کمیٹی میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ کمیٹی کے اندر بحث وتمحیص اور تیار کیے گئے نوٹس خفیہ رکھے جائیں گے اور میٹنگ کے ختم ہونے کے بعد نوٹس واپس چیئرمین کے دفتر میں جمع ہو جائیں گے۔ کمیٹی کی کئی میٹنگز ہوئیں جن میں سے 3 اپریل 2006 اور 5 مئی 2006 میں مختلف پیپر تیار اور ڈسکس

کیے گئے۔

مجموعی طور پر یہ محسوس ہوا کہ حکومت پاکستان کشمیر پر جوں کی توں صورت بحال رکھنا چاہتی ہے۔ البتہ گلگت بلتستان کو کسی نہ کسی طریقہ ملک سے مدغم کر کے اس کو ایک صوبائی یونٹ کا درجہ دینا چاہتی ہے، جو علامتی طور پر کیا بھی گیا، جب وہاں گورنر اور وزیر اعلیٰ کے نام کے سیاسی عہدے تخلیق کیے گئے، اکثر سرکاری ممبران جن میں قومی سلامتی کے ممبران شامل تھے، آزاد کشمیر کی صورتِ حال کو ایسا ہی رکھنے کہ حق میں تھے لیکن صدر مشرف کی خواہش تھی کہ سوائے گلگت بلتستان کے باقی کشمیر کے ساتھ اگر آزاد کشمیر کی سیاسی اور جغرافیائی صورتِ حال میں کوئی ردو بدل ہوتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

جوائنٹ کنٹرول اور مینجمنٹ پر صدر مشرف تیار تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اگر آزاد کشمیر کو بھی اس میں لایا جائے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ شریف الدین پیرزادہ جو 25 مئی 2006 کی میٹنگ چیئر کر رہے تھے، نے ان ہی خیالات کا اظہار کیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ جنرل مشرف کی یہی خواہش ہے۔ اس پر میں نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر آزاد کشمیر کو بھی مقبوضہ کشمیر کے ساتھ مینجمنٹ میں دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ منگلا ڈیم، جی ٹی روڈ اور کہوٹہ پلانٹ کے سر پر بھی وہ جوائنٹ فورسز ہوں گی جو کشمیر میں رہیں گی۔ بہ الفاظ دیگر ان پر ہم ہندوستان یا ہندوستان پاکستان کی مشترکہ یا بین الاقوامی فورسز کا رہنا قبول کریں گے اور کیا ایسی صورتِ حال میں پاکستان کے ان دفاعی اور سلامتی کے لیے ناگزیر اثاثہ جات کو خطرہ لاحق نہیں ہوگا؟ اس پر کمیٹی کے اکثر ممبران خاموش ہو گئے۔

بہر حال کمیٹی نے جو اپنی حتمی سفارشات مرتب کیں، اس میں اتفاق رائے سے لکھا گیا کہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کشمیر پر بات چیت کے ذریعہ پیش رفت کریں اور اس وقت تک موجودہ صورت حال میں جس حد تک بہتری ہو سکتی ہے، کرتے ہوئے اس کو قائم رکھا جائے۔ سفارشات مشرف کے چار نکاتی فارمولہ کے مغائر تھیں۔ اس رپورٹ کے بعد پھر کبھی اس کمیٹی کی میٹنگ نہیں ہوئی بلکہ مشرف کا چار نکاتی فارمولہ خوب چلا جس کے نمایاں خدوخال جنرل مشرف کی کتاب In the Line of Fire کے صفحہ 303 پر یوں درج ہیں:۔

The idea has four elements and can be summarized as follows:

1. First, identify the geographic regions of Kashmir that need resolution. At present the Pakistani part is divided into two regions: Northern Areas and Azad Kashmir. The Indian part is divided into three regions: Jammu, Srinagar, and Ladakh. Are all these on the table of discussion, or are there ethnic, political, and strategic considerations dictating some give and take?

2. Second, demilitarize the identified region or regions and curb all militant aspects of the struggle for freedom. This will give comfort to the Kashmiris, who are fed up with the fight and killing on both sides.

3. Third, introduce self-governance or self-rule in the identified region or regions. Let the Kashmiris have the satisfaction of running their own affairs without having an international character and remaining short of independence.

4. Fourth, and most important, have a joint management mechanism with a membership consisting of Pakistanis, Indians , and Kashmiris overseeing self-governance and dealing with residual subjects common to all identified regions and those subjects that are beyond the scope of self-governance.

This idea is purely personal and would need refinement. It would also need to be sold to the public by all involved parties for acceptance.

یہ فارمولہ لگ بھگ ڈکسن فارمولہ نمبر 2 ہے۔ ڈکسن فارمولہ کے تحت کشمیر کے جن علاقوں

میں نتائج ظاہر ہیں، ان میں رائے شماری کرانے کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان واضح طور پاکستان کے ساتھ ہیں جبکہ جموں اور لداخ کے علاقے ہندوستان کے ساتھ ہیں۔ صرف وادی کشمیر اور اس کے ملحق جموں خطہ میں پیر پنجال اور چناب ویلی کے لوگوں کی رائے معلوم کرنی ہے کیوں کہ یہاں غالب اکثریت کی رائے کا اندازہ کسی اور طریقہ سے نہیں لگایا جا سکتا۔

امریکہ میں ہونے والے 9/11 کے واقعہ اور افغانستان کی طرف سے دباؤ کے بعد جب مجاہدین کو دہشت گرد اور آزادی کی تحریکوں کو بالخصوص اسلامی ملکوں کے حوالے سے، مشرف نے یہ فارمولہ پیش کیا، بدلتے ہوئے عالمی حالات اور ہندوستان پاکستان کی صورتِ حال کے پیش نظر یہ فارمولہ بھی غیر معقول بھی نہیں لگتا۔ مقبوضہ کشمیر کی غالب اکثریت اس کی حامی ہے۔ حتیٰ کہ حریت کانفرنس کا میر واعظ گروپ اس کی بڑھ چڑھ کر حمایت کرتا تھا جو مشرف کے بعد اس کی مخالفت کر رہا ہے جبکہ گیلانی گروپ اس کا شروع سے مخالف چلا آ رہا ہے۔ ہندوستان کی سول سوسائٹی بھی اس پر بہت خوش ہے لیکن حکومت ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی جماعتیں واضح طور پر اس کے حق میں نہیں ہیں۔ ہندوستان کی حکومت تو خاموش ہے کیوں کہ اس سے اس کے موقف کو تقویت ملتی ہے کہ صورت حال تبدیل نہیں ہو رہی بلکہ کشمیر پر ہندوستان کا موقف تسلیم کیا جا رہا ہے کہ وہ اس پر اپنا تسلط برقرار رکھے۔ لیکن اس کی خواہش ہے کہ پاکستان اپنی تجاویز دیتا جائے کہ اس کے پاس بالآخر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ رہے کہ موجودہ جغرافیائی صورتِ حال کو تسلیم کرتے ہوئے تقسیم کو قبول کر لے، جبکہ ہندوستان اور پاکستانی سیاسی جماعتیں کشمیر کا تنازع قائم رکھ کر اس پر ملکی اقتدار کے لیے سیاست کرتی ہیں کیوں کہ دونوں ملکوں کی سیاست کی بنیاد ایک دوسرے کی دشمنی پر قائم ہے اور یہ دشمنی کشمیر کا مسئلہ قائم رکھنے سے ہی قائم رہ سکتی ہے، اس لیے لگتا نہیں ہے کہ اس کو کوئی حل ہونے دے۔

بہت مشکل ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
اہل دانش نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

175

اکتوبر 2005ء کا زلزلہ

زلزلے ہیں قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد، باغ اور راولاکوٹ کے علاوہ بالاکوٹ، ضلع مانسہرہ، ہندوستانی کشمیر کی تحصیل اوڑی اور کرناہ میں 8 اکتوبر 2005 کو صبح 8 بج کر 52 منٹ بروز ہفتہ ایک قیامت خیز زلزلہ آیا جس کی ریکٹر سکیل پر شدت 7.6 تھی اور محض چند لمحوں میں اس زلزلے نے آزاد کشمیر کی حدود کے اندر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 73 ہزار افراد کو لقمہ اجل بنا دیا جبکہ غیر سرکاری اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ ان میں سے 67 فیصد سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بچے بچیاں اور استاد، عدالتوں میں سائلین اور اہلکار تھے، فصل کٹائی کا موسم ہونے کی وجہ سے جو دیہاتی کھیتوں میں کام کرتے تھے، ان میں سے تو کم لیکن جو گھروں میں تھے، وہ دائمی طور اجل کو لبیک کہہ گئے۔ سکول کے کم سن بچے انتہائی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں سسکتے سسکتے جان دے بیٹھے۔ زخمیوں کی تعداد ہزاروں اور جائیداد کا نقصان اربوں میں ہوا۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا، میں صحت کی ناسازی کی وجہ سے روزے میں نہیں تھا۔ قہوہ پی رہا تھا کہ اچانک ایک گونج کی آواز سنائی دی لگتا تھا کہیں دور دھماکہ ہوا ہے جس کی گونج ہم تک پہنچی ہے۔ میں اچانک دیوار پر جا لگا، قہوہ کا پیالہ ہاتھ سے گرا۔ میری بیٹیاں اور ایک بیٹا راشد اس دن گھر پر تھے۔ بیٹیاں فوری طور پر میرے کمرے میں آئیں لیکن میں گم سم محو حیرت تھا اور حواس تقریباً کھو کر زمین سے چپک گیا تھا۔ بیٹی نویدہ مجھے زبردستی گھسیٹ کے باہر لائی جہاں ہو کا رچی تھی، فضا دھواں دار اور گرد و غبار سے دھندآلود ہو گئی تھی۔ ہمارے صحن کے قریب درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے، مکان کے اوپر پانی کی ٹینکیوں نے چھلک کر پورے گھر کو سیراب کر دیا تھا۔ ایک ٹینکی اچھل کر اپنی جگہ سے تقریباً تیس فٹ کے فاصلے پر جا لگی، حالاں کہ یہ کنکریٹ کی تھی۔ زلزلہ سے چند منٹ پہلے میرے صحن کے پنجرے میں موجود فینسی اور درختوں پر پرندوں نے ہُو ہُو کا رچا رکھی تھی۔ میں نے اپنے ملازم کو ماجرا جاننے کے لیے

باہر بھیجا جس نے جواب دیا کہ کوئی سبب پتہ نہیں چلتا کہ پرندے کیوں چیختے ہیں۔ اس کے چند منٹ یعنی کوئی 20/25 منٹ کے بعد گونج نے سب راز فاش کر دیا جو پرندوں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ کہتے ہیں چرندوں اور پرندوں کی قدرتی آفات بالخصوص زلزلہ بھانپنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے جو ہونے والے حادثے کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ سسمک سینٹر والے ان حالات کو جاننے کے لیے ان کی مدد بھی لے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں سائنس دان اس کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔

قدرت نے میرے گھر کے فینسی پرندے آزاد کر دیئے۔ پنجرے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ مکان کی بالائی منزل کی دیواریں گر گئیں لیکن جستی چادروں کی چھت اپنی جگہ قائم رہی۔ زیریں منزل میں شدید دراڑیں آئیں لیکن کوئی دیوار گری نہیں۔ میرے بیٹے راشد کا کمرہ جو بالائی منزل میں تھا، کے سرہانے کی دیوار نکل کر باہر کی طرف گری اور اللہ نے محفوظ رکھا۔ لیکن بالائی منزل کی سیڑھی دیوار کے گرنے سے بند ہو گئی تھی جس وجہ سے وہ مکان کے بالائی ٹیرس پر محصور ہو گیا اور کچھ دیر بعد سیڑھیوں سے چھلانگ لگا کر نیچے آیا۔ میرے محلے کے سارے لوگ ایک جگہ اکھٹے ہو گئے، ان پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ مکان کے اندر جانے کی کوئی ہمت نہیں کرتا تھا۔

میرے مکان کے قریب ہی ایک فوجی بریگیڈ ہے اور اس کے ساتھ بہت بڑا اسٹیڈیم بھی ہے جو آناً فاناً لوگوں سے بھر گیا۔ اس کے اندر جتنی بارکیں تھیں، ان میں سے اکثر منہدم ہو گئیں اور فوجی جانیں دے بیٹھے۔ سڑکیں اور گلیاں لوگوں کی آہ وبکاہ سے سر پر آسماں اٹھائے ہوئے تھیں۔ مواصلاتی نظام ختم، سڑکیں اور پہاڑ دریا برد ہو گئے۔ ٹیلیفون کا نظام ختم ہو گیا، اس لیے بیرونی دنیا سے رابطہ ہی کٹ گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرے محلے میں صرف میرا فون چلتا تھا جس کو میں نے گلی میں لا کر رکھ دیا۔ جس کو نصیب سے کوئی عزیز مل سکتا، اپنی خیریت کی اطلاع دے دیتا، ورنہ کئی لوگ کئی کئی دن تک ایک دوسرے کی خیریت جاننے سے محروم رہے۔ میرے والد صاحب (مرحوم) محض دو گھنٹے بعد کمر بندھے ہوئے ہماری خیریت معلوم کرنے کے لیے گھر آ پہنچے جبکہ ایسا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ والدین کی شفقت ہوتی ہے۔ میرے گھر کے قریب فوجی سٹیڈیم میں 2/3 گھنٹوں کے اندر

اندر فوجی ہیلی کاپٹروں کی کارروائی جاری ہو گئی۔ یکے بعد دیگرے ہیلی کاپٹر میرے مکان کی چھت پر فضا میں سٹیڈیم میں جگہ خالی ہونے کے انتظار میں کھڑے ہونے شروع ہو گئے۔ ایک خوفناک کیفیت برپا ہو گئی، یہ ہیلی کاپٹر زلزلہ زدہ علاقوں سے زخمیوں کو لا کر سٹیڈیم میں رکھتے جہاں ان کی ابتدائی مرہم پٹی کے بعد ان کو ملک کے مختلف ہسپتالوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ کسی کو کوئی علم نہیں تھا کہ اس کا عزیز رشتہ دار کس ہسپتال میں پہنچایا گیا ہے لیکن جو شخص بھی کسی ہسپتال میں پہنچا، وہ محفوظ ترین جگہ پہنچ گیا۔

فوج نے آناً فاناً حالات کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پہلی ترجیح زخمیوں کی جان بچانا تھی اور فوج نے اپنی جان پر کھیل کر یہ ذمہ داری ادا کی۔ چوں کہ ہمارے ہاں فوج اور عوام میں فاصلہ صرف وردی کا ہے، انسانی تعلقات اور ہمدردی میں کوئی فرق نہیں ہے، اس قربت نے امدادی کارروائی کو یقینی اور محفوظ بنا دیا۔ اگر فوج نے معاملات کو اپنی گرفت میں نہ لیا ہوتا، نہ معلوم کتنی تباہی ہو گئی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے گھر کے افراد بلکہ محلہ میں سب افراد کو محفوظ رکھا لیکن گھر کسی کا سلامت اور قابل رہائش نہیں رہا۔

؎ اونچے نیچے گھر تھے بستی میں بہت
زلزلے نے سب برابر کر دیئے

ہمارا ذاتی طور پر یہ جانی نقصان ہوا کہ 1990 سے ہمارے ساتھ کام کرنے والا ایک بے لوث، دیانت دار، جانثار ملازم عبداللطیف اپنے گھر میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور ہمیں ایک ایسی حالت میں چھوڑ گیا کہ ہم بے دست و پا ہو گئے۔ وہ ہمارے گھر کا سربراہ ملازم تھا۔ اللہ اس کو بہشت نصیب کرے، آمین۔ اس کی بیوی اور ایک بچہ بھی وفات پا گیا۔ جو بچے کھچے لوگ رہ گئے، اللہ نے ان کو بہت اچھی طرح سے سنبھلنے کا موقع دے دیا۔ اس کے تین یتیم بچے اب کالج/یونیورسٹی میں ہیں۔

ایک ہمسائے راجہ رفیق کے مکان کے برآمدے میں ہم سب لوگ قیام پذیر ہو گئے۔ ہیلی کاپٹروں کی گونج گرج کے علاوہ وقفے وقفے سے زلزلہ کے چھوٹے چھوٹے جھٹکوں نے سب کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ رات کو سیاہ رنگ کی شدید بارش نے ہمیں گھیر لیا اور سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ ہم لوگوں نے میدان میں ہی چاول پکا کر محلے والوں کے سمیت دال چاول کھا کر گزارا کیا۔ پانی کی شدید

قلت پیدا ہوگئی تھی کیوں کہ سارا نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ بڑے چھوٹے اور حفظ مراتب کی تقسیم ختم ہوگئی تھی، ہر کوئی دوسرے کی فکر میں ہی لگا تھا۔ فوج نے ہنگامی بنیادوں پر سڑکوں کو جوڑنے کا کام شروع کیا۔ تیسرے دن ایبٹ آباد، راولپنڈی سے ملانے والی اور چھٹے دن کوہالہ راولپنڈی روڈ پر ٹریفک رواں کر دی۔ اگلے روز کراچی سے بالاکوٹ تک امداد پہنچانے والی گاڑیوں کی قطار لگ گئی جن کا تانتا ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا اور مظفر آباد کی سڑک بند ہونے کی وجہ سے وہاں رک گئی تھیں لیکن جونہی راستہ کھلا تو مظفر آباد شہر اور مضافات میں تنبو، چاول، دودھ، گھی، آٹا، کپڑے، کمبل، پانی کے ذخیرے لگ گئے۔ حرص پرستوں نے اپنی حرص کی آگ کو بجھایا لیکن سامان اتنا وافر تھا کہ کوئی شخص بھوک پیاس یا کسی سہولت سے محروم نہیں رہا۔ ہم لوگ سال بھر کے چاول پنجاب سے منگوا رکھتے ہیں، ہم نے وہ سب بانٹ دیئے۔ اس طرح بستر، کمبل وغیرہ بھی ضرورت مندوں کی نذر کر دیئے۔ دنیا اور زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا لیکن اب وہ سب کچھ بھول گئے ہیں۔ یہی انسان کا خاصا ہے، وہ عبرت نہیں پکڑتا۔ ''ظالم اور جاہل ہے۔''

زندگی میں دوسری بار مجھے ایسی آفات میں کام کرنے کا موقع ملا۔ پہلی بار 1967 میں جب کرناہ کے کنڈی بازار میں آگ لگی تھی، میں نے متعدد دکان داروں کا مال نکال کر بچایا اور دوسری بار اس زلزلہ میں سٹیڈیم میں فوج کے ہمراہ زخمیوں کو ہیلی کاپٹر میں بٹھانے کا کام کیا۔ لگتا نہیں تھا کہ میں 50/60 سال کا ہوں، جذبہ 25/30 سال کا لگتا تھا۔ حکومتی نظام اور اس کے تمام ادارے مفلوج ہوگئے تھے۔ ہمارے وزیر اعظم نے بے بسی کے عالم میں کہا کہ ''میں قبرستان کا وزیر اعظم ہوں''۔ وہ بھی رات بھر ایک برآمدے میں بیٹھا رہا جبکہ تمام سرکاری ملازمین اپنے اپنے گھر والوں کی مدد کے لیے کام چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

جنگ اور طوفان میں تمام قوانین معطل ہو جاتے ہیں، اس وقت صرف قدرت کا قانون چلتا ہے جو انسانی حس ہے، اگر صالح ہے تو مثبت نتیجے مرتب کرتی ہے، وگرنہ طوفان اور تباہی کو ہزار گنا بڑھا دیتی ہے۔ ہر شخص کی اپنی داستان ہے، جو دوسرے سے مختلف ہے، کیا کیا کہا جائے۔ ملک بھر کے لوگوں اور بیرون ملک پاکستانیوں کی ہمدردی اور جانثاری دیدنی تھی۔ اللہ یہ جذبہ قائم دائم رکھے۔ اس زلزلہ میں

ہمارے کئی عزیز رشتہ دار جان کی بازی ہار بیٹھے۔ بڑوں بڑوں کو بھی جنازے میں تین چار آدمی نماز جنازہ پڑھنے کو نصیب نہ ہوئے۔ مظفر آباد شہر کی مشہور صاحب حیثیت سیاسی اور سماجی خدمات کی حامل شخصیات خواجہ محمد عثمان اور سید سلیم گیلانی کے جنازوں میں بے بسی کے عالم میں چند لوگ ہی شریک ہوئے۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغِ نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

قبرستانوں میں اجتماعی قبریں کھودی جا رہی تھیں۔ زمین قبروں کے لیے کم پڑ گئی تھی۔ نئے قبرستان وجود میں آ گئے۔ پرانوں میں مُردوں نے وسعت پیدا کر دی۔ جو لوگ اپنی زمینوں پر نظریں نہیں ڈالنے دیتے تھے، انہوں نے اس کو قبرستان کے لیے وقف کر دیا۔ چوروں لٹیروں نے اس ابتلا کے عالم میں بھی اپنے پیشے سے بھرپور وفا کی۔ دکانوں، گھروں بلکہ بستیوں کو لوٹتے رہے۔ جس کا پیشہ ہے، وہ حرم پاک میں بھی جیب کاٹ لیتا ہے۔ ملک اور دنیا بھر کی رفاعی تنظیموں نے ان علاقوں میں ڈیرے ڈال دیئے۔ حسب مقدور کام کیا اور لوگوں کو امداد پہنچائی۔ مقامی طور پر مذہبی اور عسکری تنظیموں نے جان جوکھوں کے کام کیے، ان میں لشکر طیبہ کا کام نمایاں ہے جس نے امداد سے ہسپتالوں تک خدمات کی انتہا کر دی۔ بین الاقوامی سطح پر ترکی، متحدہ عرب امارات، کویت، سعودی عرب، امریکہ، چین، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ، کوریا، کیوبا، قطر، لیبیا، اقوام متحدہ نے تعمیر نو میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ متحدہ عرب امارات، سعودی عرب اور ترکی نے ہسپتال، کالج، سکول، جامعات، سرکاری دفاتر مواصلات کی عارضی اور مستقل بنیادوں پر تعمیر کے علاوہ ان میں ضروری سامان بھی مہیا کیا جن کو چلانے کے لیے ہمارے پاس ماہرین بھی نہیں ہیں۔ کیوبا اور ترکی نے اپنے خرچ پر شہدا اور زلزلہ متاثرین کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم بھی اپنے ملک میں دی۔ اس وقت کیوبا سے فارغ التحصیل کئی ڈاکٹرز خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ ان ملکوں کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ زلزلہ شہدا اور متاثرین کے خون کئی عالی شان عمارتوں اور سڑکوں کی بنیادوں کا باعث بنے جو عام حالات میں آئندہ دو سو سال تک ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ کینیڈا نے زلزلہ متاثرین کے لیے امیگریشن کی سکیم کھولی جس کے تحت کئی جائز و

ناجائز لوگوں کی چاندی ہوگئی۔

جانیں تو گئیں لیکن نسلوں اور شہروں کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر گئیں۔ اللہ ان کو بہشت نصیب کرے، آمین۔ اس وقت مظفر آباد اور زلزلہ سے متاثرہ دیگر علاقے اتنے ترقی یافتہ نظر آتے ہیں جو زلزلہ سے پہلے یا بدوں زلزلہ سینکڑوں سال تک ایسے نہیں ہو سکتے تھے۔ حکومت نے کماحقہٗ نقصان کے معاوضہ کا اہتمام بھی کیا جو نقصان کی مالیت سے تو کم لیکن حکومت کی معاونت شامل رہی۔ اکثر خود غرض اور لالچی لوگوں نے اس میں بھی دھوکہ کیا۔ نقصان نہ ہونے کے باوجود بھی نقصان ظاہر کیا جس کا ملی بھگت سے معاوضہ بھی لے لیا اور جانی نقصان کا معاوضہ الگ۔ تعمیر نو تو ہوگئی اب اس کو سنبھالنے والوں پر منحصر ہے کہ اس کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ زلزلہ نے تعمیر و ترقی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ جہاں ترقیاتی اور امدادی کام ہوتے ہیں، وہاں کرپشن بھی ہوتی ہے اور زلزلہ کی امداد کے لیے آنے والے سامان اور رقم میں بے تحاشا بدعنوانی ہوئی، تعمیر نو پر مامور انتظامی افراد نے روزگار کی نئی اور پُرتعیش آسامیاں پیدا کر کے اس رقم کو شیر مادر کی طرح لوٹا اور میرے اندازے کے مطابق 70 فیصد رقم فرضی انتظامی اخراجات پر ضائع کی گئی۔ زلزلہ کے دوران اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک روزگار کے نئے نئے ذرائع کھل گئے۔ جو لوگ عام گھروں میں ملازمت یا سرکاری اداروں میں دو ہزار سے چار ہزار روپے تک اجرت لیتے تھے، ان کی اجرت 15 سے 17 ہزار ہوگئی۔ اس سے معیارِ زندگی وقتی طور پر بلند ہو گیا لیکن یہ رسد خشک ہونے پر گداگری، چوری اور بداخلاقی پر اتر آئے۔ اس عرصہ کے دوران مناسب سربراہی میسر نہیں رہی جو اس مصیبت کو قوم سازی میں منتقل کر سکے کیوں کہ مصیبت ایک موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ عقلمند اور دوراندیش قومیں اس کو منصوبہ بندی سے مستقبل سنوارنے کے لیے استعمال کرتی ہیں جو ہم نہیں کر سکے۔ ملکی اور غیر ملکی رفاعی اداروں نے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اس طرح کام پر لگایا، اس طرح سماجی اور معاشرتی قدریں ہی بدل دیں، جس وجہ سے بہت سی اخلاقی قباحتیں پیدا ہوگئی ہیں۔

چند روز کے بعد میں اپنے بچوں، والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ اسلام آباد منتقل ہو گیا۔

میرے بہن بھائی تو کچھ ماہ بعد واپس مظفر آباد آ گئے جبکہ میں تقریباً تین سال تک وہیں مقیم رہا۔ اسلام آباد F-10 میں میرے ایک دوست عمر محمود قصوری نے ایک مکان بدوں کرایہ کے میرے حوالے کیا جو اس کے ہانگ کانگ میں رہنے والے رشتہ داروں کا تھا۔ اللہ اس کو جزائے خیر دے۔ اس عرصہ کے دوران مظفر آباد والے مکان کی بالائی منزل دوبارہ تعمیر اور زیریں منزل کی مرمت کر کے یہاں واپس آیا۔ اسلام آباد میں اس وقت کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری صاحب نے اسلام آباد پولیس کے اہلکار میری حفاظت کے لیے مامور کیے اور ہر طرح کا خیال کیا۔ اس کے علاوہ زلزلہ زدہ علاقوں کا دورہ کرنے خود آئے اور میرے گھر پر بھی تشریف لائے۔ صاحب ثروت کشمیری باشندوں نے جو بیرون ملک آباد ہیں، لوگوں کی بھرپور مدد کی۔ ہمارے ایک دوست راجہ شیر باز خان نے جستی چادروں کا ایک ٹرک معہ اپنے نمائندے کرنل ریٹائرڈ منظور صاحب کے میرے گھر بھیجا جو لوگوں میں تقسیم کی گئیں۔ اس کے علاوہ ٹینٹ چادریں، کمبل، کھانے پینے کا سامان، ہر شخص نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر لوگوں کی خدمت کا سامان مہیا کیا۔ افسوس ہے کہ کچھ لوگوں نے مدد کرنے والے لوگوں کے مال سے بھرے ٹرک لوٹ بھی لیے اور ان کی مار پٹائی بھی کی جو زیادہ تر کوہالہ مظفر آباد کے درمیان ہوا۔ زلزلہ زدہ علاقوں کو مرکزی سطح پر مربوط کیا گیا جس کے لیے ERRA کا ادارہ بنایا گیا جو Earthquake Reconstruction & Rehabilitation Authority کا مخفف ہے۔ اس کے تحت صوبائی سطح کے ادارے بنائے گئے۔ مخیر حضرات اور رفاعی تنظیموں کی امداد کے علاوہ جو انہوں نے اپنی ایجنسیوں کے ذریعے انجام دیں، دنیا کی حکومتوں کی امداد حکومت پاکستان کے ذریعہ ERRA کے زیر اہتمام مہیا کی جاتی رہی۔ ان علاقوں کی باضابطہ منصوبہ بندی کی گئی ہے جس میں سڑکیں، گلیاں، نکاسی آب وغیرہ کی پلاننگ مرتب شدہ ہے لیکن موقع پر کام اس طریقے سے نہیں ہو رہا۔ آزاد کشمیر کو منصوبہ شدہ منصوبوں کے لیے رقم مہیا کرنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں، کچھ تو ختم یا منتقل کر دیئے گئے ہیں لیکن صوبہ خیبر پختونخواہ کے منصوبے جاری ہیں کیوں کہ مرکز میں ان کے نمائندے اس میں حائل ہیں۔ جبکہ آزاد کشمیر کا مرکز میں سوائے بیوروکریسی کے کوئی نمائندہ نہیں ہے۔

آزاد کشمیر علاقائی اور قبلائی مرض میں مبتلا ہے جس وجہ سے زلزلہ زدہ علاقوں کی امداد کو دیگر علاقوں میں بھی اسی مفروضہ پر منتقل کیا گیا کہ اس وجہ سے دوسرے علاقے احساسِ محرومی کا شکار ہوجائیں گے۔ یہ بیان اس وقت کے وزیراعظم سردار سکندر حیات نے دیا جو وزارتِ عظمیٰ کے شایانِ شان نہیں تھا۔ دیگر بے شمار ترقی کے مواقع کے علاوہ روزگار کے مواقع میسر آئے۔ شہری لوگ ملک کے بڑے بڑے شہروں اور دیہاتی لوگ مقامی شہروں میں آباد ہو گئے۔ مواصلات کے نظام میں موبائل نیٹ ورک عام ہو گیا جس کی اس سے پہلے فوج سکیوریٹی کے نام پر مخالفت کرتی تھی۔ اس نے کاروبار اور رابطے آسان کر دیئے۔

قیامت خیز گھڑی تو گزر گئی لیکن اتنی ترقی، خوشحالی اور Opening دی گئی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جانے والے پوچھتے ہوں گے، ''ہمارے بعد کیا گزری عزیزو۔۔۔ سناؤ۔ شہر کیسا رہ گیا؟'' کوئی انہیں بتا دے کہ تمہارے لہو نے چمن سنوار دیا۔ اللہ بچھڑنے والوں کو جنت الفردوس نصیب کرے، شہر اور شہریوں کو صبر، سکون، خوشحالی اور ایمان دے۔

مجھ کو بتاؤ پھر مری دنیا کہاں گئی
کہتے ہو تم اگر قیامت نہیں ہوئی

جیوڈیشل کرائسز کا عروج

آزاد کشمیر میں عدالتی بحران کی ابتدا تو دراصل اس وقت ہوئی تھی جب ریاض اختر صاحب کو چیف جسٹس کی سفارش کے بغیر جج ہائی کورٹ بنایا گیا۔ اس عدالتی بحران میں اضافہ اس وقت ہوا جب ان کو چوہدری محمد تاج سے انتہائی جونیئر ہونے کے باوجود چیف جسٹس ہائی کورٹ بنایا گیا۔ اس دوران انہوں نے مختلف ہتھکنڈے اپنا کر چیف الیکشن کمشنر کا منصب حاصل کیا۔ یہ بحران اپنی انتہا کو تب پہنچا جب خواجہ محمد سعید صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں چیف جسٹس سپریم کورٹ بنایا گیا۔ حالاں کہ اس وقت ان کو سپریم کورٹ کا جج بنے محض 20 دن ہوئے تھے۔ اور سپریم کورٹ میں ایک فیصلہ

بھی نہیں کیا تھا۔ یہ میرے لیے انتہائی ناقابل قبول عمل تھا کیوں کہ عدلیہ میں وہ مجھ سے سات سال اور سپریم کورٹ میں چار سال جونیئر تھے۔ میرے لیے نہ پائے رفتن اور نہ جانے ماندن والی بات تھی۔ ان کی اچانک تقرری میرے لیے ایک شاک سے کم نہ تھی کیوں کہ ان کی تقرری کا نوٹیفکیشن جاری ہونے سے پہلے کونسل کے جوائنٹ سیکریٹری سجاد بھٹہ نے مجھے اطلاع دی کہ میرے بطور چیف جسٹس تقرری کی سمری وزیراعظم پاکستان کو بھیج دی گئی ہے۔ جنرل انور خان صدر آزاد کشمیر کے بعد یہ روایت راجہ ذوالقرنین نے بطور صدر دوبارہ ایجنسیوں کی اعانت سے پروان چڑھائی۔ یہ دونوں صدور آزاد کشمیر کی عدلیہ کی روایات اور اقدار کو پامال کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے بعد سردار یعقوب نے شریعت کورٹ کو کھلواڑ بنا دیا۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے 15 اکتوبر 2006 رات 10:00 بجے مجھے خود فون کر کے بتایا کہ صدر پاکستان نے وزیراعظم کو ہدایت کر دی ہے کہ میری تقرری بطور چیف جسٹس کر دی جائے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اس تقرری کا اختیار وزیراعظم پاکستان کے پاس بطور چیئرمین کشمیر کونسل ہوتا ہے لیکن جنرل مشرف کے دور میں سارے معاملات کا فیصلہ بالخصوص آزاد کشمیر کے حوالہ سے، جنرل مشرف، M.I کے مشورہ سے کرتے تھے جبکہ سول اتھارٹیز ان کی ہدایات پر عمل کرتی تھیں۔ وزیراعظم اس وقت شوکت عزیز ہوا کرتے تھے جو حکومت کا ظاہری چہرہ تھا، فی الواقع جنرل مشرف ہی سب کچھ تھا۔ ایک میٹنگ میں بیٹھے ہوئے شوکت عزیز اس وقت ہانپتے کانپتے اُٹھ کھڑے ہوئے جب ملٹری سیکریٹری نے ان کو کہا کہ صدر صاحب کا فون ہے، شوکت عزیز نے جلدی میں اٹھتے ہوئے کہا کہ ''باس کا بلاوا ہے۔''

میں نے اس سے قبل کیانی صاحب سے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ غالباً ملٹری انٹیلی جینس کی مداخلت کی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا جا رہا ہے کیوں کہ جنرل ندیم اعجاز جو اس تنظیم کے سربراہ ہیں مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ چوں کہ جنرل پرویز مشرف کے رشتہ دار بھی تھے، اس لیے ان کا اثر و رسوخ زیادہ تھا۔ لیکن کیانی صاحب نے کہا کہ معاملات طے ہو گئے ہیں پریشانی کی بات نہیں، اس بات کی تصدیق اس وقت کے پاکستان کے سیکریٹری قانون جسٹس ریٹائرڈ منصور نے بھی کی تھی۔ بابر اعوان وزیر

قانون پاکستان نے بھی مجھے مبارکباد دی تھی کہ معاملہ حتمی ہو گیا ہے۔ جب اس کی بھنک ملٹری انٹیلی جینس کے مقامی بریگیڈیئر چوہدری غضنفر کو ہوئی، جو آزاد کشمیر کے 2006 کے انتخابات کرانے کا خاص کردار تھا۔ اس نے جنرل ندیم اعجاز کے زریعہ جنرل مشرف سے سردار عتیق احمد خان، راجہ ذولقرنین خان جو اس وقت وزیر اعظم اور صدر تھے، کی 18 اکتوبر کی صبح ملاقات کرائی۔ سردار عتیق احمد خان اسمبلی کا اجلاس چھوڑ کر وہاں گئے۔ صدر پاکستان کو جنرل ندیم کی سربراہی میں نہ معلوم کیا پٹی پڑھائی گئی جس پر بدوں وزارت کی سمری کے شوکت عزیز وزیر اعظم پاکستان کو M.I کے کسی ٹائپ رائٹر سے ایک ایڈوائس تیار کر کے ریاض اختر کو چیف جسٹس بنانے کی ہدایت کی گئی۔ مجھے اس واقعہ کی اطلاع اس وقت کے سیکریٹری امور کشمیر جاوید صادق نے بھی دی تھی کہ سب کچھ بالا بالا ہوا ہے، وزارت میں سے کوئی تجویز نہیں بھیجی گئی۔

پہلے مجھے صدر آزاد کشمیر سردار انور کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ایم آئی نے میرے خلاف کوئی رپورٹ تیار کر رکھی تھی کہ میرا اکثر مقبوضہ کشمیر آنا جانا رہتا ہے، وہاں کے لوگوں اور آئی بی کے ساتھ میرے تعلقات ہیں اور میں حریت کانفرنس کے خلاف بولتا ہوں۔ مجھے انور خان نے ایم آئی کی ایک رپورٹ کی نقل بھی دی جس میں درج تھا کہ میں کشمیر سے واپس آ کر پاکستانی نواز لوگوں کے خلاف بولتا رہا۔ یہ بھی الزام لگایا گیا کہ لندن میں مقیم ایک متحرک سماجی کارکن نذیر گیلانی کے ساتھ تعلقات ہیں جس پر یہ لوگ شک کرتے تھے۔ ان دنوں کشمیر سے رحیم راتھر وزیر، ظفر شاہ ایڈووکیٹ، الطاف حسین بھی اسلام آباد آئے تھے جن کے ساتھ بھی میری ملاقات ہوئی کیوں کہ یہ میرے یونیورسٹی فیلو تھے۔ حریت کانفرنس کے عبدالغنی بھٹ اور بلال لون کے ساتھ بھی میری ملاقات رہی جو میرے ذاتی تعلقات والے لوگ ہیں۔ اس کو ایکسپلائٹ کیا گیا۔ جنرل مشرف ان باتوں میں آ گئے۔ حالاں کہ میرے ان کے ساتھ ذاتی تعلقات بھی تھے اور انہوں نے خود مجھے کشمیر پر قانونی کمیٹی کا ممبر بھی نامزد کیا تھا۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ حکومت کے تعلقات کو صحیح اور میرے ساتھ ان کے تعلقات میرے لیے قابل تعزیر بنائے گئے؟؟ جو چاہے تیری نگاہ کرشمہ ساز کرے۔ اس پر اور حیرانگی یہ کہ جب میں نے ARJK کی بنیاد ڈال کر آزاد کشمیر کو پاکستان کے صوبوں کے برابر بنانے کا مطالبہ کیا اور اس پر لکھنا

شروع کیا تو مجھے آئی ایس آئی کا ایجنٹ کہا جانے لگا۔ غیر روایتی منفرد سوچ 175 رکھنے والے لوگوں کے لیے کھلے آسمان تلے زمین تنگ کر دی جاتی ہے۔ صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے والی قوتیں اپنے مفادات کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے نئی تبدیلی کی مخالفت اور تبدیلی لانے والوں کو غدار کہتے ہیں۔ اور اگر تبدیلی آ جائے تو اس کو اپنا لینے میں سرفہرست ہوتے ہیں۔ اس لیے انگریزی مقولہ حسب حال ہے:

Success has many fathes, but failure is always orphan.

جب ایڈوائس کشمیر کونسل سیکریٹریٹ پہنچی تو مجھے قیصر مجید جوائنٹ سیکریٹری کشمیر کونسل نے بتا دیا۔ اس کے بعد میں حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے چیمبر سے اپنے ذاتی کاغذات وغیرہ نکال کر گھر لے گیا تا کہ میرے استعفیٰ دینے کی صورت میں ان کاغذات کو ریاض اختر صاحب ضائع نہ کروا دیں۔ موصوف کی تقرری کے بعد 27 اکتوبر 2006 کو صبح ساڑھے سات بجے ان کو ایوان صدر میں حلف دیا گیا۔ یہ آزاد کشمیر میں چھٹی کا دن ہوتا ہے لیکن سرکاری ایجنسیوں نے اس خوف سے اسی روز کا انتخاب کیا کہ کام کے دن پر ممکن ہے ہائی کورٹ حکم امتناعی جاری کر دے یا ملازم تنظیمیں مزاحمت کریں۔ اکثر وکیل اس عمل پر سیخ پا تھے۔ مجھے راجہ سجاد احمد خان اور راجہ صداقت خان (جسٹس) ایڈووکیٹ نے کہا تھا کہ وہ اس روز اپنے کالے کوٹ اور لائسنس جلا ڈالیں گے لیکن نہ معلوم کن مصلحتوں کی بنا پر یہ دونوں اس روز غائب ہو گئے۔ فوج کے خوف سے مزاحمت نہیں ہو سکی لیکن تقریب میں وکلاء میں سے محض وہ لوگ گئے تھے جن کے معاملات ایجنسیوں اور عتیق احمد خان سے وابستہ تھے۔ چوہدری ابراہیم ضیا (چیف جسٹس) نے مجھے عتیق خان سے ملنے کا مشورہ دیا لیکن میں نے اتفاق نہیں کیا کیوں کہ اس سے عتیق خان کو میری اخلاقی شکست کا احساس پیدا ہوتا۔ ریاض اختر کے چیف جسٹس کے عرصہ کے دوران چیف جسٹس ابراہیم ضیا، اس کے خلاف پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے، جبکہ باقی سب لیٹ گئے تھے، اور ریاض اختر کی خوشامد میں ذلت کی انتہا تک چلے گئے تھے۔ جسٹس ابراہیم ضیا نے پاکستان کے عدالتی بحران میں بھی بھرپور حصہ ادا کیا، لیکن زبانی جمع خرچ کر کے چیف جسٹس (ر) اعظم خان اس کا کریڈٹ سمیٹتے رہے۔

کئی وکلا نے مجھے مزاحمت کرنے، استعفیٰ دینے، قانونی چارہ جوئی وغیرہ کی ترغیب دی اور کئی نے کام جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ ایسے حالات میں فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ میں نے اس خدشہ کے پیش نظر ریاض اختر کے حلف لینے سے ایک دن پہلے ہی چھے ماہ کی رخصت لے رکھی تھی۔ چنانچہ اس کے حلف کے ایک روز بعد میں چھے ماہ کی رخصت پر چلا گیا۔ وکلاء تنظیموں اور سول سوسائٹی نے جسٹس ریاض اختر کی تقرری کی شدید مذمت کی سردار خالد ابراہیم نے اسمبلی میں مذمتی قرارداد بھی پیش کی، لیکن سپیکر شاہ غلام قادر نے اس کو کارروائی کا حصہ نہ بنایا۔ تاہم خالد ابراہیم اس پر بھرپور بولے۔ لندن سے چلنے والے ایک ٹی وی چینل ''اپنا دیس'' نے اس پر بھرپور پروگرام کیے جن کی نشریات میرپور سے ہوتی تھیں۔ اس پر خفیہ اداروں کے دباؤ کے تحت خالد چوہان ایس ایس پی نے چڑھائی کر کے اس کو بند کروایا۔ سید نذیر گیلانی معروف دانشور نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس لاقانونیت کے خلاف اپنی رپورٹ رجسٹر کروائی، اس طرح عالمی سطح پر اس کا نوٹس لیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر اور ہندوستان کی اخباروں میں معاملہ زیادہ اچھالا گیا۔ مقبوضہ کشمیر کی بار ایسوسی ایشنز میں اس کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس کی گئیں۔ فوج کے کچھ حلقوں میں اس ردعمل کو سکیورٹی تھرٹ کے طور سٹڈی ٹاپک بنایا گیا۔

قطع نظر اس بات کے کہ ریاض اختر کے چیف جسٹس بننے کے بظاہر اسباب مختلف تھے، میں عقیدے کی بنا پر محسوس کرتا ہوں کہ یہ اسباب اس روز صبح کے وقت میرے مرحوم والد صاحب کے ساتھ نامناسب رویہ سے مرتب ہوئے۔ ایک خاندانی معاملے پر اختلاف کرتے ہوئے میں نے والد صاحب مرحوم کے ساتھ گستاخانہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ مجھے یقیناً اس کی سزا ملی گو کہ میں نے اسی وقت ان سے معافی مانگی تھی اور انہوں نے خندہ پیشانی سے کہا تھا، گستاخی بچوں کا کام ہے بڑوں کا نہیں۔

جس روز موصوف کی تقرری کا نوٹیفکیشن ہوا، میں ان کے چیمبر میں گیا جہاں جسٹس غلام مصطفیٰ مغل بھی تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ دنیاداری کی رسم کے طور پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں لیکن آپ نے چوں کہ ناانصافی کی ہے اور ڈاکہ ڈالا ہے، یہ خوشی آپ کو نصیب نہیں ہوگی۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ نے اپنا طرزِ عمل درست رکھا تو ادارے کی خاطر آپ کے ساتھ میرا بھرپور

تعاون رہے گا لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل طے کر لوں گا۔[175] یہ کہہ کر میں گھر چلا گیا۔

ان دنوں حج کی پروازیں جاری تھیں۔ میں نے وزارتِ حج میں رابطہ کر کے اپنے اور بیوی کے لیے حج کی سیٹیں کروالیں۔ الحمدللہ مجھے فوری طور پر یہ انعام مل گیا۔ میری بیوی کا سفر سے ایک روز قبل پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی، لیکن ہم نے اس کے باوجود سفر کیا اور ان کا پورا حج وہیل چیئر پر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ میں دنگ رہ گیا۔ الحمدللہ۔ وگرنہ میرا حج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ہائی کورٹ میں قائم مقام چیف جسٹس

ریاض اختر صاحب کی سپریم کورٹ میں غیر آئینی تقرری کے بعد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کی اسامی مستقل طور پر خالی ہوئی تھی جس پر سردار محمد نواز خان کی تقرری آئینی تقاضا تھا لیکن ریاض اختر چوہدری، صدر آزاد کشمیر راجہ ذوالقرنین خان، ملٹری انٹیلی جینس کی ملی بھگت سے ان کی مستقل تقرری نہیں ہونے دی گئی جو زائد از تین سال ہائی کورٹ کے قائم مقام سربراہ رہ کر اس حالت میں ریٹائر ہو گئے۔ یہ ناانصافی اور بدانتظامی کی انتہا تھی۔ محمد نواز خان اگر ریاض اختر چوہدری کی بطور چیف جسٹس حلف کی تقریب میں شامل نہ ہوتے تو ان کا قد کاٹھ یقیناً بڑھ جاتا اور ممکن ہے کہ ریاض اختر اور اس کے مربی اس کے چیف جسٹس ہائی کورٹ بننے میں مخل بھی نہ ہوتے۔

رخصت کی منسوخی اور جوائننگ

ریاض اختر صاحب نے چیف جسٹس کی حیثیت سے پہلے ہائی کورٹ میں اور پھر سپریم کورٹ میں مانیٹرنگ سیل کے نام سے ایک سیل بنایا۔ یہ دراصل بلیک میلنگ کا اڈہ تھا جس کا کام شرفاء اور بیوروکریسی اور عتیق مخالفوں کو تنگ کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مانیٹرنگ سیل کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چند معروف بلیک میلروں کا کاروبار چل نکلا۔ ریاض اختر نے ہائی کورٹ میں ہی بدنامِ زمانہ مانیٹرنگ سیل قائم کیا تھا، لیکن حیرانی ہے کہ اس کے کسی ساتھی نے اس کے خلاف مزاحمت نہیں کی، جس وجہ سے سپریم

کورٹ میں زیادہ بے لگام ہو گیا۔ جب ہر سو ہو کا عالم تھا، ایسے میں مَیں نے نظام کو بچانے کی خاطر دوبارہ حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے میں چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان افتخار چوہدری کی نظر بندی اور تحریک میں عملی طور شامل ہونے کی بنا پر میں اعلیٰ سطح پر خفیہ اداروں کے نشانے پر سرفہرست تھا۔

دوست احباب کے مشورے کے بعد میں نے 12/اپریل 2007ء کو سپریم کورٹ میں چیف جسٹس سے ملاقات اور اس کو رخصت کی منسوخی کرنے کی اطلاع دی۔ اس پر ریاض صاحب کا ردِعمل شدید تھا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت پاکستان اور پاکستانی خفیہ ادارے میرے افتخار چوہدری صاحب کے جلسے میں شامل ہونے پر بہت شاکی ہیں اور میرے خلاف ریفرنس دائر کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف نے آزاد کشمیر میں ملٹری انٹیلی جینس کے مامور بریگیڈیئر آصف خٹک کو میرے پاس یہ دھمکی دے کر بھجوایا کہ میں سپریم کورٹ اور آزاد کشمیر کا ماحول خراب کر رہا ہوں، خیریت اس میں ہے کہ میں استعفیٰ دوں تاکہ نظام مناسب طریقے سے چلتا رہے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ نوکری میں رہنا یا نہ رہنا، میرا اپنا فیصلہ ہے اگر حکومت میرے خلاف ریفرنس فائل کرنا چاہتی ہے تو کر لے۔ میں نے جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

میں نے 13اپریل کو رخصت منسوخی کا نوٹ لکھ کر جوائن کر لیا۔ یہ چیف جسٹس اور خواجہ شہاد احمد، جو اس وقت خفیہ اداروں کی وجہ سے جج بنائے گئے تھے، کے لیے بہت بڑا دھچکہ تھا۔ انہوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے اس کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں نے دفتر آنا جانا جاری رکھا۔ مجھے کوئی بھی کام نہیں دیا جاتا اور نہ ہی چائے کے وقفہ میں شامل کیا جاتا تھا۔ رجسٹرار کے ذریعہ مختلف نوٹ پکڑائے جاتے جس کا میں کڑا کے دار جواب دے کر ان کو چپ کرا دیتا تھا۔ میری رخصت کے دوران میرا چیمبر شہاد صاحب کو دیا گیا اور مجھے ایک پنجرہ نما کمرے میں بٹھایا گیا جس کی چھت ٹپکتی، قالین کٹے پھٹے، کرسیاں خستہ حال اور ٹیلیفون بند تھا، میرے بسیار کہنے کے باوجود رجسٹرار ٹال مٹول کرتا رہا۔ بہر حال میں نے اس کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ ریاض اختر صاحب اتنے بے لگام ہو گئے تھے کہ قاعدہ قانون اور آئین ان کے سامنے ہیچ اور خود کو پوری ریاست اور حکومت کا مالک سمجھتے تھے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا

کیوں کہ حکومت وقت یعنی سردار عتیق احمد خان کی حکومت اس کی اور وہ خود خفیہ اداروں کی دھاندلی کی پیداوار تھے، جو اس وقت سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ انتظامیہ اور عدلیہ اس کے سامنے بے بس ہو گئے تھے۔ مانیٹرنگ سیل میں ہر دن کسی نہ کسی کو بلا کر ذلیل اور بے عزت کر کے اپنی روح کی تسکین اور دوست واحباب کے کام کروائے جاتے تھے۔ سب لوگ بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نظام سے باہر رہا تو یہ ادارہ مکمل تباہ ہو جائے گا۔ وکالت کا ادارہ، دلالی کا اڈہ اور بیوروکریسی یرغمال بن جائے گی۔ مجھے کسی میں یہ جان نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس کو قابو کرے۔ لہٰذا میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا۔

ادھر پاکستان میں عدالتی بحران زوروں پر تھے۔ ملک بھر کے جج اور وکلا تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ چیف جسٹس کے جگہ جگہ فنکشن ہو رہے تھے جس کے اثرات آزاد کشمیر میں بھی مرتب ہو رہے تھے۔ میرا معاملہ بھی اسی پس منظر میں قومی سطح پر ابھرنے لگا۔ ٹی وی چینلز اور اخبارات نے ان کو موضوع بنایا اور میرا معاملہ بھی چیف جسٹس پاکستان کے معاملہ سے جوڑ دیا۔ ''اپنا ٹی وی'' چینل نے 25،26اپریل 2007 کو اس پر ایک گھنٹے کا پروگرام کیا جس سے دنیا بھر میں کشمیری لوگ متحرک ہو گئے اور میرے ساتھ رابطے بڑھنے لگے۔ ریاض اختر اور اس کے دوست اس سے بہت گھبرا گئے، جس کے بعد چیف جسٹس نے مجھے کبھی کبھار ایک آدھا کیس سننے کے لیے دینا شروع کر دیا۔ میں بہر حال پریس میں نہیں آیا اور نہ ہی کوئی بات کی۔ اس کے برعکس ریاض اختر ہر ٹی وی چینل اور اخبار میں پہنچتے رہے جس سے ان کی پوزیشن اور زیادہ کمزور ہو گی۔

میرے پاس یکم مئی 2009 کو جسٹس غلام مصطفیٰ مغل پہلی بار، غالباً ریاض اختر کا پیغام لے کر آئے کہ وہ مجھ سے کچھ ضمانت چاہتے ہیں۔ مغل صاحب کی مبہم سی گفتگو کا مقصد تھا کہ یہ لوگ خود اپنے جال میں پھنس جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میرے خلاف ریفرنس تیار ہے، صرف دائر کرنے کی دیر ہے۔ میں ان کی مبہم گفتگو نہیں سمجھ سکا۔ بہر حال ان کا میرے ساتھ اس سارے عرصہ کے دوران یہ پہلا رابطہ تھا۔ میں نے ان باتوں کا سوائے اس کے اور کوئی نوٹس نہیں لیا کہ ریاض اختر کا گروہ اب

بکھرتا جا رہا ہے۔ کیوں کہ جب تک وہ مضبوط تھا، مغل صاحب نے میرے ساتھ بات تک کرنا چھوڑ دی تھی۔ اب حالات بدل رہے ہیں، اس لیے یہ بھی دوراہے پر آ گئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بھی اس کے شر سے بچنے کے لیے خاموش رہے۔

آزاد کشمیر بار کونسل نے متفقہ قرارداد پاس کی کہ سنیارٹی کے اصول کے تحت ریاض اختر کو ہٹا کر مجھے چیف جسٹس مقرر کیا جائے۔ یہ بہت بڑا Set Back تھا۔ اس کے بعد یہ تحریک پھیل گئی اور چیف جسٹس پاکستان کے کیس کے ساتھ میرا کیس بھی موضوع بحث بن گیا۔ چیف جسٹس کو وکلاء نے آزاد کشمیر آنے کی دعوت بھی دی تھی جو اس نے قبول کر لی اور راولاکوٹ کے مقام پر 30 جون 2007 کو آنے کا پروگرام بنا لیکن نہ معلوم کن وجوہات کی بنا پر اس نے 27 جون کو یہ دورہ نہ ہونے کی اطلاع بذریعہ اعتزاز احسن دی۔ باوثوق ذرائع سے پتا چلا کہ اعتزاز احسن جو جاٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں، نے میر پور کے جاٹوں کے دباؤ پر یہ دورہ منسوخ کرایا کیوں کہ اس سے ریاض اختر اور عتیق خان کی پوزیشن اور زیادہ کمزور ہو جاتی۔

ہم لوگ بھلے کتنے ہی فلاسفر اور دانشور بن جائیں یا پیش کیے جائیں، لیکن چھوٹے چھوٹے مفادات کے اسیر بنے رہتے ہیں۔ اعتزاز احسن نے 28 مارچ کو بھی یہی کیا تھا جب میں راولپنڈی ہائی کورٹ بار میں چوہدری افتخار صاحب کے جلسے میں شامل ہوا۔ اس میں پنجاب کی ایک سول جج خاتون بھی آئی تھی۔ موصوف نے میرا تذکرہ تو نہیں کیا، لیکن سول جج کے شامل ہونے کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ یہ ''بارش کا پہلا قطرہ ہے۔'' پاکستانی زعماء آزاد کشمیر کو، غالباً مرکزی حکومت سازی میں وزن نہ ہونے کی وجہ سے طفیلی سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیڈر اس میں بھی اپنی عزت محسوس کرتے ہیں۔ کمزور قوموں کے لیڈروں کا یہی وتیرہ ہوتا ہے۔

سپریم کورٹ میں دلچسپ واقعات

جب میں نے جوائن کرنے کا فیصلہ کیا، اس وقت کے مظفر آباد میں ملٹری انٹیلی جینس کے

بریگیڈیئر آصف خٹک دو بار میرے گھر اور ایک بار مجھے اپنے گھر چائے پر ملے۔ موصوف نے مہذب اور شائستہ لیکن دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ میرے جوائن کرنے سے نظام خراب ہو جائے گا، میرے خلاف ریفرنس ہوگا جس میں بہت گند اچھلے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے یہ سارا کچھ سن کر بریگیڈیئر کو کہہ دیا کہ ریاض اختر کے کنڈکٹ کے پیش نظر میرا جوائن کرنا ناگزیر ہے، اس لیے حکومت جو چاہے کرے، میں ریفرنس بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے انتہائی خود اعتمادی اور اللہ پر بھروسے سے بریگیڈیئر کو کہا کہ ناانصافی پر مبنی یہ نظام اور لوگ نہیں چل سکتے، خواہ وہ ریاض ہو، عتیق ہو یا جنرل مشرف، یہ سارے لوگ یکے بعد دیگرے ختم ہو جائیں گے۔ (اللہ کا کرنا ایسا ہی ہوا۔ عتیق خان اور پاکستان میں جنرل مشرف کی حکومت ختم ہوگئی اور ادھر ریاض اختر یتیم ہو گیا)۔ بریگیڈیئر نے دال گلتی نہ دیکھ کر مزید کہا کہ آپ اور آپ کے بچوں کی سرینگر حریت رہنماؤں سے بھی اس بارے میں بات ہوتی ہے۔ اس سب سے یہ بات واضح ہوگئی کہ میرے اور میرے گھر والوں کے فون ٹیپ کیے جا رہے تھے۔ (یہی نہیں بلکہ فوج میں جن افسروں کے ساتھ میرے رابطے تھے، ان کو بھی غالباً میرے ساتھ رابطہ نہ رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ ان لوگوں نے رابطے منقطع کر دیئے)۔ بریگیڈیئر صاحب نے مجھے استعفیٰ دینے کی صورت میں پنشن اور دیگر مراعات کے ساتھ ساتھ سرکاری اعزاز کے ساتھ رخصت کرنے کی پیشکش کی۔ اس پر میں مسکرا کر رہ گیا۔ مسکرانے کے علاوہ اور جواب ہی کیا دے سکتا تھا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ذاتی طور پر بریگیڈیئر خٹک نیک اور شریف انسان تھے لیکن جنرل ندیم اعجاز جس کو مشرف نے آزاد کشمیر کا انچارج مقرر کیا تھا، انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ یہ قصور ادارے کا نہیں بلکہ مہم جو جرنیلوں کا ہے جو ادارے کو بھی بدنام کرتے ہیں تا کہ صاحب خوش رہے۔ جنرل ندیم اعجاز نے ISI کے کشمیر کے سیاسی معاملات کے انچارج بریگیڈیئر جاوید عزیز جس کا کوڈ نام راٹھور تھا، کو بھی مجھے فکس کرنے کو کہا، لیکن وہ اس معاملہ میں غیر جانبدار رہے بلکہ میرے معترف تھے۔

اس عرصہ کے دوران میرے استحقاق کے مطابق ملازم، گاڑیاں، پٹرول، گاڑیوں کی مرمت غرض یہ کہ استحقاق نام کی کوئی چیز بھی مجھ پر حرام کر دی گئی۔ اگر تنخواہ براہ راست بینک میں نہ جاتی

ہوتی تو یقیناً یہ بھی رک جاتی۔ مجھے سننے کے لیے مقدمات، عدالتی چیمبر اور لائبریری کے لیے استحقاق سے بھی محروم کیا گیا تھا۔ سپریم کورٹ کے چند ایک ملازم ریاض صاحب کے ذاتی غلام بن گئے تھے اور باقی ڈرے سہمے اس کے خوف کی وجہ سے مجھ سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی کیا مجال جب جج بھی بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔

ایک روز میرے چیمبر کو تالا لگایا گیا جو میں نے توڑ دیا اور پھر ایک دن سپریم کورٹ کا انٹری گیٹ پولیس کے ذریعہ بند کر دیا گیا۔ میں نے ٹی وی چینل والوں کو بلا کر اس کی نمائش کرائی جس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ دوبارہ اہلکاران یار ریاض اختر کو ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کوئی انسان اتنا گر سکتا ہے اور وہ بھی علاقہ کی سب سے بڑی عدالت کا سب سے بڑا جج جو کئی سال میرے ماتحت اور تقریباً دس سال اس نے میرے ساتھ کام کیا ہو؟ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اس کا یقین کرے گا۔ موصوف نے اخلاق، انصاف،، رواداری، تہذیب اور کوڈ آف کنڈکٹ کی خلاف ورزی کے سارے ریکارڈ توڑے لیکن الحمدللہ میرے حوصلے مزید توانا ہوتے گئے۔

نہ صرف سپریم کورٹ بلکہ ہائی کورٹ کے جج بھی سہم گئے تھے۔ جن لوگوں کی آبیاری میں نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی، وہ اجنبی بن گئے تھے۔ یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ میرے گھر آنے جانے کی بات کجا، فون پر بات یا کسی تقریب میں ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

میرے ذاتی استعمال کی گاڑی کو ایک پولیس وین کے پھسلنے کی وجہ سے ڈینٹنگ کی ضرورت پڑی۔ یہ بات میں نے رجسٹرار کے نوٹس میں لائی جس نے چیف جسٹس کے حکم پر کہا کہ پہلے اس کی FIR درج کی جائے اور ذمہ داری کا تعین کیا جائے کہ غلطی کس کی ہے۔ حالاں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور ہائی کورٹ میں کئی بار موصوف کی گاڑی کو مکمل اوور ہال کرنے کے علاوہ روز بروز ٹکرانے سے اس کی مرمت کراتا رہا۔ استحقاق کے مطابق سپریم کورٹ کے ججوں کو ایک گاڑی اپنے استعمال کے لیے حاصل ہے اور اگر ججز ٹور پر جائیں تو دوسری گاڑی ان کی فیملی کے لیے موجود ہوتی ہے۔ موصوف نے مجھ سے دوسری گاڑی فوری طور پول میں جمع کروانے کا حکم دیا جس کی میں نے تعمیل نہیں کی لیکن موصوف نے

دفتر والوں کو کہا کہ ان کی صرف ایک گاڑی کے Wear and Tear چارجز کی ذمہ داری لینی ہے۔

میں نے ایک روز رخصت لینے کے لیے موصوف کو نوٹ بھیجا جس پر انہوں نے اعتراض کیا کہ اتنی رخصت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ عدالت کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ حالاں کہ جج نے محض نوٹ رکھ کر اپنی چھٹی کے بارے میں اطلاع دینی ہوتی ہے، لیکن میں نے تعلقات اچھے رکھنے کے لیے ایسا کیا۔ تاہم اس کے بعد میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس روز بھی نوٹ رکھ کر نکل گیا، ان کو پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ایک مقدمہ کی سماعت کے دوران میر پور میں فل بنچ کے سامنے مجاہد حسین نقوی ایڈووکیٹ نے مجھ پر اعتراضات اور کچھ فقرے کسنے شروع کیے جن کے لیے چیف جسٹس ان کو مزید بھڑکا رہے تھے۔ میں نے پہلے تو نرم انداز میں وکیل کو غیر متعلقہ باتیں کرنے سے منع کیا لیکن جب وہ باز نہ آیا تو میں نے اس کو سختی سے کہا کہ تم میرے ساتھ بیٹھنے والے لوگوں کے کہنے پر ایسا کر رہے ہو۔ اگر تم نے یہ گفتگو بند نہ کی تو میں مقدمہ نہیں سنوں گا اور اس واقعہ کی ذمہ داری چیف جسٹس پر ہوگی۔ جس پر موصوف سہم گئے اور مقدمہ کی سماعت ملتوی کی گئی۔

عام ملازمین کو حکم دے رکھا تھا کہ میرا حکم نہ مانیں۔ چنانچہ میری گھنٹی یا بلانے پر کوئی عمل نہ کرتا اور نہ ہی کوئی بات سنتا تھا۔ میرا ٹیلیفون ٹیپ کیا جاتا تھا اور مجھے ملنے کے لیے آنے والوں کو اس وقت تک بلڈنگ کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ ہوتی تھی جب تک وہ اپنا پورا نام پتہ نہ لکھوا دیں۔ میرے لکھے ہوئے فیصلے پہلے چیف جسٹس کو دکھائے جاتے اور اگر کسی کے نام نوٹس جاری کرنے کا حکم دیتا، چیف جسٹس کی منظوری کے بغیر دفتر والے نوٹس جاری نہیں کرتے تھے۔ میرے گھر کے اردگرد خفیہ اداروں کے لوگ گشت کرتے رہتے۔ میرے گھر سے پولیس گارڈ بھی ہٹوا دی گئی تھی۔ محض رسمی طور پر دو سپاہی ڈیوٹی پر تھے، وہ بھی اپنی مرضی کے، جو جاسوسی کے لیے رکھے گئے تھے اور میرے گھر آنے جانے والوں کی رپورٹ ان کو پیش کرتے تھے۔ عدالتی عملہ چوں کہ چیف جسٹس کے ماتحت ہوتا ہے، اس لیے میں ان کی باز پرس بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی وہ بے چارے بے بس تھے اور کسی نہ کسی طرح

میرے پاس اپنی بے بسی کا اظہار بھی کرتے۔ مجھے اس بات کا احساس تھا، اس لیے میں نے کبھی کسی کے ساتھ سختی نہیں کی اور نہ کبھی تلخ بات کی۔

یہی نہیں میرے عزیز و اقارب کو بھی عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ میری بیٹی نویدہ جو محکمہ تعلیم میں لیکچرر اور راولپنڈی میں شادی شدہ ہے، کو روٹین کے پراسس میں پنجاب حکومت اور آزاد کشمیر حکومت کی رضا مندی سے راولپنڈی کے ایک کالج میں ڈیپوٹیشن پر تعینات کیا گیا لیکن راتوں رات پنجاب حکومت سے اس کی ڈیپوٹیشن منسوخ کرا کر لیپہ میں تعینات کر دیا گیا۔ یہ محض مجھے زیر بار کرنے کے لیے کیا گیا۔ میرا بھائی ظہور گیلانی جو ڈپٹی کمشنر کیڈر میں تھا، کھڈے لائن لگایا گیا۔ لیکن میرے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

فی الحقیقت یہ بہت ہی توہین آمیز رویہ تھا۔ نہ معلوم اللہ کی ذات نے مجھے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ کس طرح دیا۔ خدا تعالیٰ کا کیا عمدہ قول ہے کہ بسا اوقات جو فیصلے تمہارے حق میں نظر آتے ہیں لیکن فی الحقیقت تمہارے خلاف ہوتے ہیں اور بسا اوقات کچھ فیصلے تمہارے خلاف نظر آتے ہیں لیکن تمہارے حق میں ہوتے ہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ بعد کے واقعات سے یہ واضح ہو گیا کہ میرے لیے واقعی اسی میں بہتری تھی۔ ریاض اختر صاحب نے خفیہ اداروں کے ساتھ تعلقات اور میرے خلاف حساس اداروں کی مخاصمت، سردار عتیق خان کی ریاض اور فوجی نواز حکومت، میرے چیف جسٹس پاکستان افتخار محمد چوہدری کی عدلیہ بحالی تحریک میں شمولیت کی وجہ سے میرے دوست و ساتھی، اہلکاران، سیاسی اور سماجی شخصیات مجھ سے ملنے، بات کرنے، تعلق رکھنے یا کسی قسم کا علیک سلیک کرنا اپنے لیے پریشانی کا باعث سمجھتے تھے۔ میرا سایہ بھی مجھ سے بھاگتا تھا۔ مجھے تنہا کیا گیا۔ سوائے میرے گھر کے بچیوں اور بچوں کے میرا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ لیکن لوگ اشارتاً کنایتاً میری داد ضرور دیتے تھے کہ میں جوان مردی کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ چند وکیل میرے پاس آتے جاتے رہے۔

چیف جسٹس ہائی کورٹ کے پرائیویٹ سیکریٹری طارق قریشی نے ان مخدوش حالات میں

بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میرے ساتھ رشتہ بحال رکھا۔ اس نے تمام لوگوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میرے معاملات کا خیال رکھا۔ میرے مختلف لوگوں کو خطوط، ان کے جوابات، میری کتاب کا مسودہ، اس جوان نے تن تنہا تیار کیا۔ اس سارے عرصہ کے دوران صرف یہی ایک شخص میرا ہم خیال اور غمگسار رہا۔ میرے حج سے واپسی کے بعد سپریم کورٹ کے چند ملازم مجھے مبارک باد دینے آئے۔ ان کی ریاض اختر نے وہ درگت بنائی کہ دوبارہ میرا فون تک اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔ طارق کے علاوہ احتشام ملک جو پرائیویٹ سیکریٹری تھا لیکن رخصت پر انگلینڈ چلا گیا تھا، میرا خیال رکھا کرتا تھا۔ میرے ہائی کورٹ میں سابقہ ساتھیوں نے بھی میرے ساتھ رابطہ ختم کر دیا۔ فون تک بھی نہیں سنتے تھے۔ سپریم کورٹ میں مجھے چائے کے وقفے میں بھی شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک ساتھی نے میرے پلاٹ سے ملحق میری بنائی گئی پردہ وال گرا دی اور مستری کو وہاں سے بھگا دیا۔ میں کم از کم اس سے اس بات کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ کیوں کہ کئی بڑے بڑے اقتدار والے لوگوں کی ناراضی مول لے کر ہمیشہ اس کے ساتھ چٹان کی طرح ڈٹا رہا۔ حضرت مولا علیؓ کا فرمان کس قدر عظیم ہے، ''جس سے نیکی کرو، اس کے شر سے بچنے کی دعا مانگو''۔ اس کے خلاف شکایت کرنے کا سوچا، تحریر بھی کر دی لیکن پھر سوچا کہ معاف کر دوں یہ اللہ کو پسند ہے۔ اللہ نے مجھے دلی سکون، اطمینان، جرأت اور ہمت عطا کی اور میں یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا رہا جس کا بالآخر مجھے اللہ نے صلہ بھی دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں، جس پر احسان یا مہربانی کی جائے، اس کے ہاتھوں دانستہ یا نادانستہ ضرور کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ میرے ساتھ اکثر بلکہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا رہا۔ لیکن میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان کا تکلیف پہنچانا میری نیکی کی قبولیت کی نوید ہے، جس کا اجر اللہ ضرور دیتا ہے اور اس کا ناشکرا ضرور کسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنے والوں کی پرورش میں کوئی خلا رہا ہوتا ہے جس وجہ سے اپنی بڑائی یا بریت کے اظہار کے طور پر وہ ایسا کرتے ہیں۔

میں نے اس عرصہ کے دوران ایاز نقوی کمپیوٹر سینٹر والے سے پندرہ ہزار روپے میں کمپیوٹر اور پرنٹر خریدا جس پر میں نے کمپیوٹر سیکھا۔ اس پر میں نے اس وقت کی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کے

خلاف کاغذی جنگ لڑی اور الحمدللہ جیتی بھی۔ آئین کی ایک ترمیمی کتاب اور اپنی سوانح حیات لکھنے کی بھی ابتدا کی۔ اس سلسلے میں طارق قریشی، احتشام ملک، ایاز نقوی، شوکت سلہریا، میرے بیٹے ساجد گیلانی نے میری بھرپور مدد کی۔ ''مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہوگئیں!''

؎ مشکلے نیست کہ آسان نہ شود مرد باشد کہ حراساں نہ شود

اللہ نے ہر مشکل میں میری مدد کی اور میرا اس پر بھرپور بھروسہ ہے۔

میں عدالت میں چیف جسٹس کے انتظامی اور عدالتی امور پر غلط احکامات کو تحریراً چیف جسٹس کے نوٹس میں لاتا اور اس نوٹ کی کاپی صدر ریاست اور سیکریٹری قانون کو بھی بھیج دیتا۔ وہ لوگ اس کا کوئی نوٹس نہ لیتے لیکن میں اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے علاوہ تمام غلط کارروائی کو ایکسپوز کرتا رہا۔ سیاست دان اور بیوروکریسی اس شخص کے غلط طرزِ عمل سے بہت نالاں تھے اور موقع کی تلاش میں تھے کہ اس پر وار کیا جائے۔ غالباً قدرت نے اس کام کے لیے مجھے منتخب کیا تھا جس وجہ سے میں ساری توہین آمیز حرکتیں برداشت کرتا رہا۔

؎ مضبوط ارادے سے لیا جو بھی لیا ہے
جذبوں میں تھکن پاؤں میں لغزش نہیں رکھتا

2006 سے 2010 تک کے ابتدائی دور میں مجھے اللہ نے بہت سے تخلیقی کام کرنے کا موقع دیا جس میں سب سے بڑا آزاد کشمیر کے آئین پر برصغیر میں نافذ آئین اور تاریخی پس منظر میں ایک کتاب ہے جو تقریباً 1200 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو نیشنل بک فاؤنڈیشن نے چھاپا۔ میرا حلقہ احباب وسیع ہوا۔ میری جان پہچان ہوئی۔ بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ کمپیوٹر کو استعمال کرنا سیکھا جس سے دنیا بھر میں رابطہ ہوا۔ میری Calamity، Oppurtunity میں بدل گئی۔ الحمدللہ!

یہ واقعات لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ عدل و انصاف اور اعلیٰ نظم و نسق کے اداروں میں جب چھوٹے لوگ گھس جاتے ہیں یا گھسائے جاتے ہیں تو ادارے زوال پذیر ہوجاتے ہیں۔ جس کا نقصان غلط کاروں کو ذاتی طور پر اور ریاست کو مجموعی طور پر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کے بعد ججز اپنے آپ کو

ریاست کا تیسرا بڑا استون سمجھنے کی بجائے حکومتی ملازم سمجھتے ہیں اور حکومت کے خامہ پردازوں کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر تعلق و رابطہ رکھتے ہیں جس سے عدلیہ میں وہ پہلے جیسا بھرم اور دم خم نہیں رہا۔ حالاں کہ اب ان کو بے خوف اور بے نیاز ہونا چاہیے تھا۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں ججوں کی تقرری

مجھے بہت سے وکلاء دوستوں نے جن میں کرم داد خان، سید مشتاق گیلانی، سردار عبدالحمید، راجہ سجاد احمد، شمشاد خان وغیرہ شامل ہیں، نے مشورہ دیا کہ میں ریاض اختر صاحب کی تقرری کے خلاف رٹ دائر کروں۔ لیکن میں دیانت داری سے اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایسا کرنے سے نظام انصاف پر آنچ آئے گی۔ میں نے ان سب دوستوں کو منع کیا کہ وہ بھی ایسا نہ کریں، اس لیے میں اسلام آباد شفٹ ہوگیا اور پھر حج کے لیے چلا گیا۔ اس عرصہ کے دوران ہائی کورٹ میں دو نئے جج جن میں میر پور سے محمد یونس طاہر اور کوٹلی سے رفیع اللہ سلطانی اور سپریم کورٹ میں خواجہ شہاد احمد کی بطور مستقل تقرری کی گئی۔ ان کی تقرری کا طریقہ جسٹس ریاض اختر کی تقرری سے قطعاً مختلف نہیں تھا جس کا کسی دفتر میں کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔

یہ اتنا مضحکہ خیز عمل تھا کہ مجھے اس وقت کے صدر راجہ ذوالقرنین خان نے اپنے گھر میں 29 ستمبر 2006 کو بتایا کہ اس کے پاس سردار محمد نواز خان جج ہائی کورٹ کی بطور جج سپریم کورٹ اور خواجہ شہاد احمد کی بطور جج ہائی کورٹ کی ایڈوائس آئی تھی۔ لیکن بریگیڈیئر آصف خٹک نے اس پر عمل کرنے سے منع کیا جو واپس لے لی گئی اور نئے ججوں کی تقرری کی ایڈوائس آئی جس میں رفیع اللہ سلطانی اور محمد یونس طاہر بطور جج ہائی کورٹ اور خواجہ شہاد احمد بھی بطور جج سپریم کورٹ شامل تھے۔ ان کی تقرری کا بھی کسی کے پاس کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ ان کی تقرریوں کے خلاف بھی آزاد کشمیر بھر میں مزاحمت اور مظاہرے ہوئے۔ اور بالآخر ہائی کورٹ کے دونوں ججوں کی تقرری خلافِ آئین قرار دی گئی۔ یہ فیصلہ PLD 2010 HC (AJK) 23 پر درج ہے جو غلام مصطفیٰ صاحب نے بطور چیف جسٹس کیا۔ خواجہ

شہادا حمد صاحب کے خلاف رٹ پٹیشن ہائی کورٹ نے فرضی وجوہات کی بنا پر خارج کر دی، ورنہ ان سب کی تقرری بدوں کسی قانونی طریقہ کار اور ریکارڈ کے ہوئی تھی۔

اس کے بعد بھی تقرریاں حساس اداروں کی خواہش پر ہوتی رہیں کیوں کہ جنرل مشرف کی حکومت کی وجہ سے ان کو سیاسی بالادستی حاصل تھی جن میں سے اس وقت بھی لوگ عدلیہ میں موجود ہیں۔ 2012-13 میں تین ججوں کی تقرریاں ہوئیں جن میں سے دو کو چیف جسٹس ہائی کورٹ نے تجویز ہی نہیں کیا تھا، جب ان کی تقرری کا نوٹیفیکیشن ہوا تو چیف جسٹس ہائی کورٹ نے مجھ سے مشورہ چاہا۔ میں نے ان کو کہا کہ اگر ایسی صورتِ حال ہے تو وہ ان کو حلف نہ دیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو صدر صاحب کو کہیں کہ ان کے بارے میں آپ سے تحریری رائے لیں جس میں آپ ان کو تجویز کریں تا کہ آئینی تقاضے بھی پورے ہوں اور آپ کی اور نئے بننے والے ججوں کی عزت بھی رہ جائے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

چیف جسٹس پاکستان افتخار محمد چوہدری کے خلاف ریفرنس

اسی دوران جب آزاد کشمیر میں ججوں کی غلط تقرریوں اور چیف جسٹس کی تقرری کے خلاف اخبارات، رسائل اور بار کونسل کے ہنگامہ خیز خبریں اور قراردادیں ہو رہی تھیں، پاکستان کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف 9 مارچ 2007 کو مختلف الزامات پر مبنی سپریم جوڈیشل کونسل پاکستان میں ریفرنس دائر کیا گیا۔ اس سے پہلے ان کو آرمی ہاؤس راولپنڈی میں بلا کر کئی جنرلز کے سامنے بے عزت کیا گیا اور استعفیٰ دینے کا کہا گیا۔ لیکن قدرت نے ان سے بھی کام لینا تھا جو ان کے دباؤ میں نہ آئے، استعفیٰ نہ دیا جس کے بعد انہیں بغیر سکیوریٹی گارڈ کے حراست میں لے کر اسلام آباد اپنی رہائش گاہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس دوران ریفرنس پر جسٹس جاوید اقبال کی سربراہی میں کارروائی بھی شروع کی گئی۔ اس عمل کے خلاف ملک بھر میں شدید مزاحمت ہوئی۔ پورا ملک ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ ملک بھر میں وکلا تنظیموں نے نظام مفلوج کر دیا۔ 12 مارچ 2007 کو جب افتخار محمد چوہدری اپنی فیملی کے سمیت سپریم کورٹ جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے تو ان پر پولیس نے تشدد کیا، اس نے جلتی پر تیل کا کام

کیا۔ حکومت مکمل طور پر مفلوج ہو گئی۔ اس کے اثرات آزاد کشمیر میں بھی محسوس ہوئے۔ ادھر بھی تمام بار ایسوسی ایشنز اور بار کونسل نے پاکستانی وکلاء کی حمایت میں مکمل ہڑتال شروع کر دی اور ساتھ ہی آزاد کشمیر عدلیہ میں غیر قانونی تقرریوں کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔ پاکستان میں جو بھی کوئی بڑا واقعہ ہوتا ہے اس کا ریپرسل آزاد کشمیر سے کیا جاتا ہے۔ یہی کچھ عدلیہ کے ساتھ بھی ہوا۔ لیکن اب کی بار بازی الٹ گئی۔ کسی نے خوب کہا ہے،

وقت کرتا ہے پرورش برسوں　　حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

میں ان دنوں اسلام آباد میں رہائش پذیر تھا۔ 28 مارچ 2002 کو راولپنڈی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے افتخار محمد چوہدری کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے طور پر ایک بہت بڑی تقریب کا انعقاد کیا جس میں پاکستان بھر سے ججوں کو دعوت دی گئی۔ میں بھی اس تقریب میں مدعو تھا۔ پاکستان بھر سے تو کوئی جج شامل نہیں ہوا۔ البتہ میں نے اس میں ضرور شرکت کی، تقریر بھی کی اور چیف جسٹس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی بھرپور مذمت بھی کی۔ اسی روز میرے گھر سے پولیس گارڈ ہٹا دی گئی اور مختلف طریقوں سے مجھے زچ کرنے کی کوشش کی گئی۔ میری شرکت کو تمام ٹی وی چینلز اور اخبارات نے نمایاں کوریج دی جس سے وہ زخم دوبارہ تازہ ہو گئے جو آزاد کشمیر عدلیہ کو لگائے گئے تھے۔ لوگ میری جرأت اور ہمت پر بہت خوش ہوئے جس کے بعد میرے گھر پر اسلام آباد اور مظفر آباد میں وکلا اور شہریوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک میلے جیسا سماں لگتا تھا۔ پاکستان میں وکلاء تنظیموں کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتیں بھی شامل ہو گئیں جن کا اپنا ایجنڈا تھا۔ لیکن اس سے ملک بھر میں جنرل مشرف کی مہم جوئی کی وجہ سے فوج کے خلاف شدید مزاحمتی تحریک چلی اور فوجی دفاعی پوزیشن میں چلے گئے۔ وکلاء اور عوام کے جلسوں میں فوج کے خلاف ایسے مغلظات کہے جاتے تھے جن کو دہرانے کے خیال سے بھی شرم آتی ہے۔ آزاد کشمیر جو مکمل فوجی حساس اداروں کے کنٹرول میں تھا، اس میں بھی لوگوں نے دل کی بھڑاس بھرپور نکالی۔ عام فوجی بھی شرمندگی محسوس کرنے لگے حالاں کہ وہ بے قصور تھے۔ مہم جو جنرل مشرف کی وجہ سے وہ عام فوجی گیہوں میں گھن کی طرح پسے جا رہے تھے۔

وزیراعظم پاکستان سید یوسف رضا گیلانی سے ملاقات

میں نے ریاض اختر کی تقرری کے خلاف اس وقت کے وزیراعظم پاکستان شوکت عزیز کے پاس نظرثانی کی درخواست دائر کی تھی مگر انہوں نے اس کا کوئی نوٹس لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بالآخر پاکستان میں انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت بنی اور یوسف رضا گیلانی وزیراعظم منتخب ہوئے۔ اس وقت آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کی ٹاپ لیڈرشپ چوہدری عبدالمجید، چوہدری لطیف اکبر، مطلوب انقلابی وغیرہ ریاض اختر صاحب کے خلاف تھی۔ یہ لوگ راولپنڈی میں میرے گھر میں مجھے ملے اور یقین دلایا کہ وہ ہر ممکن طریقے سے ریاض اختر کو چیف جسٹس شپ سے ہٹائیں گے۔ انہوں نے قمرالزمان کائرہ سے بھی میری ملاقات کرائی جو کشمیر کے امور کے وزیر تھے۔ وہ بہت نفیس، صاف گو اور شیریں گفتار آدمی ہیں۔ انہوں نے بھی مجھے یقین دلایا کہ اس زیادتی کا ازالہ کیا جائے گا۔

اس پس منظر میں ایک دن اسلام آباد پرائم منسٹر ہاؤس سے مجھے فون آیا کہ میری ملاقات پرائم منسٹر سے مقرر کرنی ہے۔ چنانچہ 7 مئی 2008 کی تاریخ میری سہولت کے مطابق مقرر کی گئی۔ جب میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی سے پرائم منسٹر ہاؤس میں ملا اور اپنا کیس بیان کیا۔ وزیراعظم صاحب نے سماعت کے بعد برملا کہا کہ اس آئینی دھاندلی کا حل نکالنا پڑے گا اور اس کا فیصلہ پاکستان کے عدالتی بحران کے ساتھ ہی نکلے گا۔ لیکن انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لوگ اس کو ایکسپلائٹ کریں گے کہ ایک گیلانی نے دوسرے گیلانی کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ مجھے وزیراعظم پاکستان کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں وزیراعظم پاکستان سے اپنے لیے نہیں، اپنے ادارے اور اپنی ریاست کے لیے انصاف مانگ رہا ہوں، کسی گیلانی یا شوکت عزیز سے نہیں اور اگر اس کو گیلانی کے حوالہ سے ہی دیکھا جائے تو بھی صلہ رحمی کا تقاضا یہی ہے کہ ناانصافی کا ازالہ کیا جائے۔ اس کے بعد ایک روز رمضان شریف میں مجھے باقی لوگوں کے ہمراہ، جن میں زیادہ تر وزیراعظم سے ذاتی تعلقات والے اور ملتان سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے، افطاری پر بلایا گیا۔ وہاں پر بھی بات ہوئی لیکن ان کے اندازِ

ملاقات میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جو پہلی ملاقات میں تھی۔ اس سے لگا کہ ان[175] پر کچھ لوگ اثر انداز ہو گئے ہیں۔ کافی عرصہ تک انتظار کے باوجود جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے اپنے ایک دوست فوجی جنرل سے بات کی جس نے ذمہ داری لی کہ وہ اس کی پتہ برداری کریں گے۔ اس دوران نرگس سیٹھی جو وزیراعظم پاکستان کے ساتھ ایڈیشنل سیکریٹری تھیں، نے 30 ستمبر 2008 کو مجھے فون پر اطلاع دی کہ محکمہ قانون نے ریاض اختر کی تقرری کے عمل کو غیر آئینی اور میرے ساتھ شدید ناانصافی قرار دیا ہے لیکن اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ اب چیف جسٹس کو عدالتی عمل یا سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس کے ذریعے ہی نکالا جا سکتا ہے۔ تقریباً ایسی ہی بات جنرل نے بھی کی کہ وزیراعظم صاحب نے کہا ہے کہ معاملہ چوں کہ Politicise ہو چکا ہے، لہٰذا اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ حکومت پاکستان کے محکمہ قانون کی سطح پر میری نظرثانی کا جائزہ لیا گیا جس نے رائے دی کہ مجھے اس عہدے سے محروم کرنا شدید ناانصافی اور غیر آئینی عمل ہے لیکن چوں کہ دوسرا شخص چیف جسٹس بن چکا ہے، اس لیے تمام ہمدردیوں کے باوجود مداوا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات مجھے فاروق نائیک مرکزی وزیر قانون اور سیکریٹری قانون آغا رفیق نے کہی۔ قمرزمان کائرہ اور سید خورشید شاہ کو میں نے اس سلسلہ میں بہت مثبت پایا۔ تاہم اس وقت کے اٹارنی جنرل عبدالطیف کھوسہ، ریاض اختر کی طرف مائل تھے۔ کیوں کہ ان کو ریاض اختر کے پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے ایک عزیز چوہدری یاسین نے اسلام آباد میں پلاٹوں سے نوازا تھا جو ان دنوں ہاؤسنگ سوسائٹیز کے چیئرمین تھے۔

حیرانی کی بات ہے کہ جب معاملہ کو غیر آئینی پایا گیا، ناانصافی بھی قرار دیا گیا، اس کے باوجود انصاف کیوں نہیں کیا گیا؟ یہ انتظامی ناانصافی کی انتہا ہے۔ سردار عتیق احمد خان اور ان کے بھائی مرحوم خلیق احمد خان، جو یوسف رضا گیلانی سے کافی قربت رکھتے تھے، بھی اس پر حاوی رہے۔ اس طرح پنجاب کے جاٹ حضرات نے ریاض اختر کے لیے گروہ بندی کی جس وجہ سے معاملہ ٹھیک نہیں ہو سکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی۔ اگر قانون اور انصاف کے مطابق ایسا ہو گیا ہوتا، میں جون 2010 تک چیف رہتا، اس کے بعد پھر ریاض اختر نے چیف جسٹس بن کر

2016 تک رہنا تھا۔لیکن قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا کہ وہ اتنا طویل عرصہ چیف جسٹس رہے، بلکہ اس کو اس کے غرور کی سزا دینا مقصود تھا جس وجہ سے رسی ڈھیلی چھوڑ دی گئی۔اب میرے پاس سوائے عدالتی کارروائی کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

سپریم کورٹ پاکستان میں پٹیشن

جب مجھے اس حقیقت کا یقین ہو گیا کہ وزیر اعظم پاکستان میری پٹیشن کا فیصلہ نہیں کر رہے اور جنرل صاحب کے حوالہ سے پتہ چلا کہ وزیر اعظم نے معاملہ کو Politicised کہا ہے تو میں نے سپریم کورٹ پاکستان میں پٹیشن دائر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس وجہ سے کرنا پڑا کہ آزاد کشمیر کی کسی عدالت میں ایسا کیا جانا ممکن نہیں تھا۔اس سے پہلے آزاد کشمیر ہائی کورٹ میں چند وکلا نے انفرادی اور بار کونسل کے ذریعہ ریاض اختر کی تقرری کے خلاف ایک پٹیشن دائر کی تھی، جن میں کرم داد خان، مشتاق گیلانی، راجہ سجاد، نشاط کاظمی، تبسم صادق، مرزا طارق، جاوید شریف وغیرہ ایڈووکیٹس شامل ہیں۔ابھی یہ پٹیشن عدالت کے روبرو سماعت کے لیے پیش ہونی ہی تھی کہ خواجہ شہاد احمد جسٹس سپریم کورٹ نے رجسٹرار ہائی کورٹ کو ایک نوٹس جاری کر کے پٹیشن کا سارا ریکارڈ سپریم کورٹ میں پیش کروا کے اس کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی شروع کی۔اس کے ساتھ ہی اس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس بھی، جو چوہدری ریاض اختر کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھا، اور دیگر لوگوں کے ذریعہ ہائی کورٹ پر پولیس کے ذریعہ چڑھائی کروا کر، رٹ کو معہ رجسٹرار زبردستی سپریم کورٹ میں پیش کرایا، جہاں خواجہ شہاد احمد نے ایک سکہ شاہی آرڈر دیا ''کہ سارا ریکارڈ ضبط کر کے منجمد کیا جاتا ہے''۔ چنانچہ یہ پٹیشن بلا کارروائی ریاض اختر صاحب نے اپنی تحویل میں لے لی۔اسی طرح ہائی کورٹ میں دو ججوں کی تقرریوں کے خلاف بھی پٹیشن دائر کی گئی تھی جس میں ابھی ابتدائی سماعت کے لیے نوٹس ہی جاری ہوا تھا کہ دونوں ججوں مسٹر محمد یونس طاہر اور رفیع اللہ سلطانی نے ریاض اختر کے کہنے پر سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی، جس پر بھی سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کی کارروائی کو معطل کرتے ہوئے ریکارڈ اپنی تحویل میں لے لیا۔اس ساری

کارروائی کی سازش خواجہ شہاد احمد سابق چیف جسٹس کے گھر ہائی کورٹ[175] کے ایک جج، ایم آئی کے بریگیڈیئر اور چند دیگر لوگوں نے بنائی جس کو Supra Constitutional Action کا نام دیا گیا۔اور اس پلان کے مطابق عمل بھی ہوا۔

قدرت کے فیصلے وقتی طور پر ناقابل فہم، لیکن دوررس اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔اللہ نے کیا خوبصورت بات کہی ہے کہ ''تم چاہے جتنی چالیں چل لو، آخری چال اللہ کی ہی ہوتی ہے۔'' یہی دو مقدمات بالآخر چیف جسٹس کے خلاف چارج شیٹ اور برطرفی کا باعث بنے۔اگر ان کا اس نے کوئی فیصلہ کرنے دیا ہوتا تو' میرے خیال میں اس کے خلاف ریفرنس میں کیس بننا مشکل تھا۔اس پس منظر میں آزاد کشمیر میں میری طرف سے کسی بھی قسم کی کارروائی خارج از امکان تھی۔اس لیے میں نے سپریم کورٹ پاکستان میں چارہ جوئی کا فیصلہ کیا۔

پاکستان میں اپنے دوستوں عمر محمود قصوری، احمر بلال صوفی، اکرم شیخ، قاضی انور، عصمت اللہ، جسٹس رانا بھگوان داس، جسٹس دیدار شاہ وغیرہ کے مشورہ کے بعد سپریم کورٹ پاکستان میں کارروائی کے لیے تیاری مکمل کر لی۔میں نے 6 مئی 2009 کو اکرم شیخ ایڈووکیٹ کے ذریعہ پاکستان کے آئین کی دفعہ 184(3) کے تحت پٹیشن دائر کر کے موقف اختیار کیا کہ چوں کہ چیئرمین کشمیر کونسل، جن کی ہدایت پر آزاد کشمیر میں تمام ججوں کی تقرری کی جاتی ہے، وہ وزیر اعظم پاکستان ہیں، جو اسلام آباد میں بیٹھ کر یہ تمام امور انجام دیتے ہیں، اس لیے سپریم کورٹ پاکستان کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں، جبکہ بقیہ رسمی کارروائی آزاد کشمیر میں ہوتی ہے، اس لیے وزیر اعظم پاکستان کی جانب سے جاری شدہ ہدایت نامہ (ایڈوائس) کو کالعدم قرار دے کر ان کو ہدایت کی جائے کہ وہ عدلیہ میں رائج سنیارٹی کے اصولوں کے مطابق بطور چیف جسٹس تقرری کی ایڈوائس جاری کریں۔میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ آزاد کشمیر میں ہر طرح سے حکومت پاکستان ہی حکومت کرتی ہے، کیوں کہ مرکزی نوعیت کے تمام معاملات حکومت پاکستان براہ راست اور کشمیر کونسل کے نام پر، جبکہ مقامی نوعیت کے معاملات پاکستانی بیوروکریسی کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے، اس لیے آزاد کشمیر پاکستان کے آئین کی دفعہ 1(2)(d) کے

تحت ان علاقوں میں آتا ہے جن کو "Territories otherwise included in Pakistan" کے طور درج کیا گیا ہے۔ یہ ایک تہلکہ خیز مقدمہ تھا جس میں حکومت پاکستان کا آزاد کشمیر میں طریقہ کار سامنے لایا گیا تھا۔ آزاد کشمیر میں حکومت کا طریقہ کار بیان کرنے کے علاوہ، آئینی پوزیشن کو ایک نئی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اگر آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں ہے تو کیا کالونی ہے؟ کیوں کہ جو علاقہ کسی خودمختار ریاست کے زیر کنٹرول ہو، وہ یا تو اس کا حصہ ہوتا ہے یا کالونی، جبکہ میں اس کو کالونی نہیں بلکہ حصہ سمجھ کر عدالت سے حکومت پاکستان کی بدانتظامی اور ناانصافی کے خلاف چارہ جوئی کر رہا ہوں۔

اس سے پورے ملک میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا۔ آزاد کشمیر اور پاکستان کے آئینی تعلقات اور مقام کی نازک بحث چھڑ گئی۔ آزاد کشمیر کی قوم پرست جماعتوں اور غیر ملکی حساس اداروں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ ہر ٹی وی، اخبار، بین الاقوامی جریدوں میں یہ معاملہ موضوع بحث بن گیا۔ حکومت پاکستان ہل گئی۔ آزاد کشمیر میں عتیق خان کی حکومت دفاعی پوزیشن میں چلی گئی۔ جنرل مشرف کے کارندے جو پاکستان میں عدالتی بحران کی وجہ سے بہت بدنام ہو چکے تھے، بے بس ہو گئے۔ چوں کہ ایسی ناانصافی کی گئی تھی جو آئینی روایات اور پوزیشن کے مغائر تھی، اس لیے سردار عبدالقیوم خان اور عتیق خان کے روایتی ہندوستانی جاسوسی کے الزام کام نہیں آ سکے۔ اس کے باوجود سردار عبدالقیوم خان نے صدر پاکستان اور تمام پاکستانی جنرلز کو خط لکھے کہ منظور گیلانی نے سپریم کورٹ پاکستان میں پٹیشن دائر کر کے تحریک آزادی کو اتنا نقصان پہنچایا، جتنا ہندوستان کے حساس ادارے ساٹھ سال میں نہیں پہنچا سکے۔ اس خط کا عکس ضمیمے کے طور پر شامل ہے۔

میری پٹیشن کی وجہ سے آزاد کشمیر کے لوگوں کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا کہ پاکستانی حکومت یا ان کے کارندوں کی جانب سے ناانصافی کے خلاف مداوا سپریم کورٹ آف پاکستان سے ہی ہو سکتا ہے۔ ایک اور سوچ بھی پروان چڑھی کہ آزاد کشمیر کو کب تک کشمیر کی آزادی کے نام پر بند گلی میں دھکیلا جائے گا۔ لوگوں میں ناانصافی اور ظلم کے خلاف بولنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ حکومت کے

خلاف اس دھاندلی پر پہلی بار آواز اٹھائی گئی تھی، اس لیے کچھ لوگ مجھ سے ملنے سے ڈرتے اور کچھ فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ سوچ اس پٹیشن کے بعد ہی پیدا ہوئی کہ آزاد کشمیر کے آئینی نظام کو زیادہ نمائندہ اور جواب دہ بنایا جائے تاکہ حکومت سازی، پالیسی سازی اور فیصلہ سازی کے ہر مرحلے میں آزاد کشمیر کے لوگ ہر سطح پر شامل ہوں۔ اس سوچ نے اقتدار پرست سیاست دانوں کو پریشان کر دیا کیوں کہ وہ اپنی اپنی باری پر حالات کے مطابق جی او سی مری، منسٹری کشمیر اور پنڈی کے کور کمانڈر سے مل کر حکومت حاصل کر لیتے تھے، لیکن طاقت کا مرکز وسیع ہونے سے ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس پٹیشن نے سوچ کے دریچے کھول دیئے اور آزاد کشمیر میں ایکٹ 1974 کی تبدیلی/منسوخی، ہر پاپولر جماعت کی ڈیمانڈ بن گئی۔ راجہ فاروق حیدر نے یہ سوچ ایک مشن کے طور پر اپنا لی۔ آزاد کشمیر میں بااختیار حکومت بنانے، کشمیر کونسل کو ختم کرنے، پاکستانی اداروں میں نمائندگی کی سوچ اور اس پر بحث و تمحیص کی ابتدا وہی پٹیشن بنی۔

سپریم کورٹ میں میری پٹیشن پر خاطر خواہ پیش رفت تو نہیں ہوئی لیکن ہر تاریخ پیشی پر آزاد کشمیر میں ہونے والی دھاندلی موضوع بحث بن جاتی رہی۔ عدالت کے ریمارکس اور وکلاء کے دلائل اخباروں میں نمایاں طور شائع ہوتے تھے۔ سپریم کورٹ نے باضابطہ سماعت کرنے کا فیصلہ بھی نہیں کیا لیکن ہر پیشی پر ایسے ریمارکس دیئے جاتے تھے کہ حکومت ہل جاتی تھی اور آزد کشمیر میں عتیق حکومت اور ریاض اختر اور ان کے حواری اعصابی تناؤ کا شکار ہو جاتے۔ آزاد کشمیر کی تقریباً تمام بار ایسوسی ایشنز نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ چند ایک گنے چنے وکیلوں، جو وکیل کم اور دلال زیادہ تھے، نے اس کی مخالفت کی لیکن بے توقیر ہو گئے تھے۔ ملازمین کی تنظیمیں اور سیاسی جماعتیں بھی متحرک تھیں اور کئی تنظیموں اور جماعتوں نے اس تحریک کی بھرپور اور برملا اعانت کی۔

سپریم کورٹ میں کیس کے حوالہ سے حکومت پاکستان کا مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ آزاد کشمیر کونسل نے اپنے جواب میں میرے کیس کی بھرپور حمایت کی اور یہ تسلیم کیا کہ آزاد کشمیر پاکستان کا عملی طور پر حصہ ہے، وزیراعظم پاکستان سپریم کورٹ آف پاکستان کے پاس جواب دہ ہیں اور ریاض اختر

کی آئین کے خلاف تقرری باطل ہے۔ کشمیر کونسل کے سربراہ وزیراعظم پاکستان ہیں، جبکہ حکومت پاکستان کے سربراہ بھی وزیراعظم پاکستان ہیں اور ان کی جانب سے ڈپٹی اٹارنی جنرل نے بھی یہ موقف اختیار کیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد جاٹ برادری کی وجہ سے حکومت پاکستان پر دباؤ بڑھایا گیا کہ اٹارنی جنرل اپنا موقف تبدیل کرے۔ چنانچہ اٹارنی جنرل کے ذریعے پہلے موقف کے برعکس یہ موقف اختیار کیا گیا کہ سپریم کورٹ کو اختیار سماعت حاصل نہیں ہے کیوں کہ آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں ہے۔ حالاں کہ سالیٹر جنرل پاکستان، سیکریٹری کشمیر کونسل اور سیکریٹری کشمیر افیئرز نے ایک مشترکہ تحریری بیان کے ذریعہ میرے موقف سے اتفاق کیا تھا۔ اس سے حکومت پاکستان کے کشمیر پر کسی بھی قومی موقف کے فقدان کی غمازی ہوتی ہے۔ محض کیس ٹوکیس اور اس میں بھی بندہ ٹو بندہ دیکھ کر موقف اختیار کیا جاتا ہے، کوئی قومی پالیسی نہیں ہے۔ اس طرح آزاد کشمیر کے سیاستدان بھی کشمیر کو اپنے مفادات کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو عمل ان کے سیاسی اور اقتصادی مفاد کو نقصان پہنچاتا ہو، وہ کشمیر کی تحریک اور پاکستان کے مفاد کے خلاف قرار دیا جاتا ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان میں اٹارنی جنرل نے اقرار کیا کہ ریاض اختر کی تقرری غیر آئینی ہے اور حکومت پاکستان اس کو واپس لے رہی ہے، لیکن ایسا نہ کیا کیوں کہ معاملہ کو آئین کے حوالہ سے نہیں بلکہ لوگوں اور گروپوں کی نظر سے دیکھا گیا۔ میرے خیال میں سپریم کورٹ از خود اس کو کالعدم قرار نہیں دینا چاہتی تھی کیوں کہ اس سے پاکستان کی اس جھوٹی پالیسی کو حرف آتا کہ آزاد کشمیر ایک الگ سسٹم ہے جو پاکستان کے ماتحت نہیں، حالاں کہ آزاد کشمیر میں پاکستان کی حکومت کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ مقدمہ اس وقت تک بلا فیصلہ سپریم کورٹ آف پاکستان میں پڑا ہے۔ ہم سب لوگ اپنے آپ کو جھوٹے فریبوں سے بہلا رہے ہیں، جیسا کہ دنیا اس حقیقت سے لاعلم ہے کہ آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت کیا ہے اور اس کو کیسے اور کون چلا رہا ہے۔ اگر ہم خود فریبی اور منافقت کا لبادہ اتار پھینکیں تو ہمارے خود ساختہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس میں افراد اور ادارے سب شامل ہیں۔

وزیراعظم آزاد کشمیر سردار عتیق احمد خان، عدم اعتماد کی تحریک[155] کی زد میں

سپریم کورٹ آف پاکستان میں میرے مقدمہ اور اس کے ردِعمل نے آزاد کشمیر میں ہر ایک کی پوزیشن مشکوک بنا دی۔ اس نے عتیق خان کی حکومت کو اتنا کمزور کر دیا کہ اسمبلی کے اندر اس کے خلاف بغاوت ہوگئی اور اس کو عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعے وزارتِ عظمیٰ سے 6 جنوری 2009 کو الگ کر دیا گیا۔ اس کی جگہ سردار محمد یعقوب خان وزیراعظم بنائے گئے۔ سردار محمد یعقوب خان کے وزیر اعظم بننے سے سپریم کورٹ پاکستان میں کیس پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس آئینی دھاندلی کے خلاف چوہدری عبدالمجید اور یعقوب خان، جو وزیراعظم اور صدر آزاد کشمیر بننے سے پہلے بہت بولتے تھے، ایک دم دھاندلی کا دفاع کرنے لگے۔ نہ صرف یہ کہ متحارب فریق ریاض اختر صاحب اور اس دھاندلی کی حد تک یک زبان تھے، بلکہ اس وقت کے صدر راجہ ذوالقرنین، جو یوسف رضا گیلانی وزیراعظم پاکستان کے کسی طور رشتہ دار بھی ہیں، بھی ریاض اختر کی بھرپور سپورٹ کرنے لگے۔

ایک طرف یہ سارے تھے جبکہ دوسری طرف وکلاء اور رائے عامہ، جس نے ان کو بے بس کر رکھا تھا۔ کروڑوں کی رقم اس دھاندلی کے دفاع کے لیے جھونک دی گئی تھی۔ یعقوب خان کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران عتیق احمد خان قائد حزب اختلاف تھے اور مرکز میں ان کی ہمنوا حکومت تھی۔ گویا کہ طاقت کے سارے مراکز اس دھاندلی کے محافظ تھے، لیکن یہ اس کا ظاہری چہرہ تھا، اللہ آخری چال چلنے والا تھا۔ یعقوب خان کی حکومت بھی پاؤں نہیں جما سکی کیوں کہ اسمبلی کے اندر سردار عتیق احمد خان، بیرسٹر سلطان محمود اور راجہ فاروق حیدر جیسے افراد وزارت عظمیٰ کے امیدوار تھے۔ ان لوگوں نے یعقوب خان کو جمنے نہیں دیا، چنانچہ مسلم کانفرنس نے سردار عتیق خان کی قیادت میں اس کے خلاف بھی تحریک چلائی اور بالآخر یعقوب خان کے خلاف تحریک عدم اعتماد 13 اکتوبر 2009 کو اسمبلی میں پیش کی گئی۔ 22 اکتوبر 2009 کو تحریک پاس ہوئی جس کے نتیجے میں راجہ فاروق حیدر خان کو وزیراعظم منتخب کیا گیا۔

میرے لیے یہ شدید حیرانی کا مقام تھا جب اسی روز راجہ فاروق حیدر، ریاض اختر چوہدری کو

اس کے گھر ملنے گئے۔ میں نے فاروق حیدر کو فون پر شکایت کی کہ آپ نے اپنے مستقبل کی غلط ابتدا کی ہے۔ وہ خاموش رہے اور صرف اتنا کہا کہ یہ مصلحت کا تقاضا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ عتیق خان نے یہ میٹنگ منعقد کروائی تھی کہ وہ ریاض اختر کے حق میں حکومت کی حمایت یقینی بنائے رکھیں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ان کے درمیان طے ہوا تھا کہ یہ ملاقات خفیہ رکھی جائے گی لیکن عتیق خان اور ریاض اختر نے اس کی بھرپور تشہیر کرائی جس سے فاروق حیدر کی سیاسی ساکھ بہت خراب ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد میرے خیال میں فاروق حیدر نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے ریاض اختر کے خلاف ٹھان لی اور موقع کی تلاش میں رہا۔

ریاض اختر کے خلاف ریفرنس اور ہمارے استعفے

یکم اپریل 2010 کی شام راجہ فاروق حیدر خان، وزیر اعظم نے مجھے فون پر رات کے کھانے کی دعوت دی۔ میں جب وزیر اعظم ہاؤس پہنچا تو وہاں عبدالرشید عباسی وزیر قانون، راجہ محمد عباس خان سیکریٹری قانون اور فرحت میر سیکریٹری سروسز موجود تھے۔ فاروق حیدر صاحب نے رسمی گفتگو کے بعد مجھے اور عبدالرشید عباسی صاحب کو الگ کمرے میں لے جا کر کہا کہ انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ریاض اختر کے خلاف ریفرنس فائل کیا جائے جس کے لیے انہوں نے قائم مقام صدر شاہ غلام قادر اور چیف جسٹس ہائی کورٹ غلام مصطفیٰ مغل کو پہلے سے اعتماد میں لیا ہے۔ چوں کہ صدر آزاد کشمیر راجہ ذوالقرنین نے ایک دن بعد لندن جانا تھا، اس لیے یہ کارروائی اس کے جانے کے ساتھ ہی شروع کیے جانے کا عندیہ دیا۔ مجھے اس سلسلے میں راجہ عباس نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ ممکن ہے ریاض اختر کے خلاف ریفرنس فائل کیا جائے لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا کیوں کہ حالات ایسے نہیں تھے۔ مرکزی حکومت اور اس کے حساس ادارے بھرپور ریاض اختر کی پشت پر تھے اور ان کی مرضی کے بغیر ادھر پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔

ریفرنس کا میٹریل اور ریفرنس سارا وہی بیان کیا گیا جو چند دن پہلے راجہ صداقت حسین ایڈووکیٹ (اب ہائی کورٹ کے جسٹس) نے ایک تحریری شکایت کے طور اور بار کونسل نے صدر آزاد

کشمیر اور چیئرمین کشمیر کونسل کے پاس دائر کیا تھا۔ یہ بہت ہی مضبوط الزامات اور واقعات پر مبنی تھا۔ میں نے فاروق حیدر کو کشمیر کے معاملات کے وزیر میاں منظور وٹو کے ساتھ 31 مارچ کو ان کے گھر اپنی ملاقات کا احوال بھی سنایا جس میں انہوں نے مجھے سپریم کورٹ پاکستان سے کیس واپس لینے کی صورت میں آزاد کشمیر میں زکوٰۃ کونسل، اسلامی نظریاتی کونسل یا چیف الیکشن کمشنر آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے عہدوں کی پیشکش کی تھی۔ میں نے ان کو سیدھا سا جواب دیا کہ پرائم منسٹر میری نظر ثانی منظور کر کے میری پوزیشن بحال کریں، میں اس کے بعد استعفیٰ دے دوں گا اور مجھے کسی اور نوکری کی ضرورت نہیں ہے۔ فاروق حیدر نے کہا کہ مجھے اس بات کا علم ہے۔

ریفرنس پر حکومت پاکستان کے ردِعمل پر بھی بات ہوئی۔ وہ مکمل طور پر پُراعتماد نظر آئے۔ میں نے ان سے آزاد کشمیر کے چیف سیکریٹری خالد سلطان اور انسپکٹر جنرل پولیس کے بارے میں پوچھا۔ اس پر بھی وہ مکمل مطمئن تھے۔ معاملہ کا ہر لحاظ سے جائزہ لینے کے بعد میں نے سردار عبدالقیوم اور سردار عتیق کا اس سلسلے میں پوچھا جس پر عبدالرشید عباسی صاحب نے کہا کہ ان کو اس کا علم نہیں ہونے دینا۔ دائری کے بعد ان سے نمٹ لیا جائے گا۔ لگتا ہے کہ انتظامی سطح پر انہوں نے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا۔ میں رات گئے واپس گھر آیا اور یہ معاملہ کسی سے شیئر نہیں کیا کیوں کہ مجھے ناممکن لگتا تھا۔

اگلے دن میں نے غلام مصطفیٰ مغل چیف جسٹس ہائی کورٹ سے بات کی، انہوں نے تجویز دی کہ ہماری کسی جگہ ملاقات ہو جانی چاہیے۔ چنانچہ 2 اپریل کو رات دس بجے میری اور چیف جسٹس ہائی کورٹ کی میرے بھائی مظہر گیلانی کے گھر پلیٹ مظفر آباد میں ملاقات ہوئی اور ہم نے سارے معاملات شیئر کیے۔ یہ معاملہ بھی طے پایا کہ چوہدری محمد اعظم جو اَب چیف جسٹس ہیں اور راجہ ذوالقرنین کے بہت قریب اور اس کے بے حد اثر میں ہیں جنہوں نے ہی ان کی بطور ایڈہاک جج تقرری کروائی تھی، کو فارغ کیا جائے۔ سپریم کورٹ میں دوسرے مستقل جج خواجہ شہاد احمد صاحب تھے جن کی بیٹی کی شادی ریاض اختر کے بیٹے سے ہوئی تھی، اس لیے ان سب کا مفاد مشترک تھا۔ یہ سارے معاملات انتہائی رازداری سے ہوئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مجھے آخری دم تک اس بات کا یقین نہیں تھا اور یہ بھی

اتفاق ہے کہ سارے لوگ ہم خیال جمع ہو گئے۔ راجہ محمد عباس اور فرحت علی میر سیکریٹریز کا اس میں کلیدی کردار رہا جنہوں نے حد درجہ راز داری قائم رکھی۔ اس بات کا ان کو کریڈٹ جاتا ہے جس کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔

میرے خیال میں یکم اپریل 2010 کو راجہ ذوالقرنین صدر ریاست انگلینڈ کے لیے روانہ ہوئے اور 3 اپریل 2010 کو صبح گیارہ بجے راجہ محمد عباس سیکریٹری قانون اور فضل حسین ربانی ایڈووکیٹ جنرل (مرحوم) میرے چیمبر میں داخل ہوئے اور میرے سامنے ریاض اختر کے خلاف ریفرنس کی فائل رکھی۔ اس روز سپریم کورٹ کے باقی جج میر پور دورے پر تھے اور ادھر ہی کام کر رہے تھے۔ چوں کہ سپریم جوڈیشل کونسل کے باقی دو ممبرز چیف جسٹس ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے سینئر جج نے ہونا تھا، میں نے چیف جسٹس ہائی کورٹ جسٹس غلام مصطفی مغل کو فون پر ریفرنس دائر ہونے کی اطلاع دے کر ان کو سپریم کورٹ بلایا جہاں ہم نے ریفرنس کی ابتدائی سماعت کر کے اس کو باضابطہ سماعت کے لیے منظور کر کے چیف جسٹس ریاض اختر کو کام کرنے سے روک دیا۔ یہ سارا معاملہ رجسٹرار کی بھی عدم علمیت میں ہوا کیوں کہ اگر کسی کو پتہ چل جاتا تو اس پر کسی بھی قسم کی کارروائی ممکن نہیں تھی۔ جب ہم لوگ آرڈر پاس کر چکے تو رجسٹرار سپریم کورٹ کو جو سپریم جوڈیشل کونسل کے بلحاظ عہدہ رجسٹرار ہوتے ہیں، کو بلا کر حکم کے اجرا اور اس کو مشتہر کرنے کا کہا جو تذبذب کا شکار ہو کر پریشان ہو گیا۔ ساتھ ہی محمد اعظم خان صاحب کو Denotify کیا، محمد ابراہیم ضیا کی تقرری بطور ایڈہاک جج بنانے کا پروزل حکومت کو بھیجا۔ میں نے اس کی اطلاع خواجہ شہاد صاحب کو فون پر دی اور ان کو کہا کہ وہ سپریم جوڈیشل کونسل کے ممبر ہیں، اس لیے مظفر آباد آ کر کارروائی میں حصہ لیں لیکن انہوں نے روایتی گول مول باتیں کر کے ٹال دیا اور اس میں شرکت سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اس وجہ سے میں نے فائل پر نوٹ لکھ کر کارروائی شروع کر دی کہ خواجہ شہاد احمد سینئر جج سپریم کورٹ کارروائی میں شرکت نہیں کر رہے، اس لیے سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج کی ضرورت ہے جس پر محمد ابراہیم ضیا کی تقرری ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے باضابطہ کارروائی شروع کی۔ میں نے اعظم خان صاحب کو بھی فون پر افسوس کیا کہ یہ سرجیکل

آپریشن ضروری تھا، وگرنہ وہ ادارہ کے لیے اثاثہ ہیں، پھر آ جائیں گے۔ جبکہ اس نے نرم زبان میں سخت الفاظ استعمال کیے جو قدرتی ردِعمل تھا۔ میں ان کو یقینا ججی کے لیے مناسب آدمی سمجھتا تھا، گو کہ ریاض اختر کی غلط کاریوں میں وہ مکمل شریک تھا اور اس کے بعد جعلی عدالتی کارروائی اور کاغذات اور احکامات بنانے میں اس نے خواجہ شہاد کے سمیت گھناؤنا کردار ادا کیا تھا۔

اس سے پہلے جب ہم نے ریاض اختر کو کام سے روک دیا، اس پر سینئر جج کے طور پر میری تقرری بطور ایکٹنگ چیف جسٹس ہو گئی اور اسی روز ایوان صدر میں شاہ غلام قادر سپیکر اسمبلی جو قائم مقام صدر تھے، نے میرا حلف لیا جس میں وہ سارے وکلاء شامل ہوئے جن کو جلدی میں اطلاع دی جا سکتی تھی۔ مجھے پولیس کے تحفظ میں سپریم کورٹ کی بلڈنگ سے ایوانِ صدر لایا گیا۔ راستہ میں جن لوگوں نے دیکھا، ان کو گمان گزرا کہ مجھے گرفتار کیا گیا ہے کیوں کہ پولیس نے سپریم کورٹ اور سیکریٹریٹ جانے والی تمام سڑکیں ناکہ بندی کے ذریعہ بند کر رکھی تھیں۔ ایک خوف کی کیفیت طاری تھی۔ مرکزی حکومت کو جب اپنی ایجنسیوں کے ذریعہ اس کی اطلاع ملی، اس پر مرکزی وزیر داخلہ عبدالرحمان ملک نے وزیراعظم فاروق حیدر سے اس کے بارے میں دریافت کیا جس نے کہا کہ معمول کے امن و امان کے مسئلہ کے پیشِ نظر ایسا کیا گیا ہے۔

یہ بات میرے لیے انتہائی حیرانی کا باعث تھی کہ اتنا بڑا واقعہ ہوا جس میں پوری مرکزی حکومت دلچسپی رکھتی تھی، اس کو پتہ نہیں چل سکا! اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے لوگ اگر دلچسپی اور ایمانداری سے کام کریں تو یقینا کمال کا کام کر سکتے ہیں۔ ریاض اختر کے طرزِ عمل سے بیوروکریسی بہت تنگ تھی کیوں کہ یہ لوگوں کو بلیک میل کر کے ذلیل کرتا اور اپنے کام کرواتا تھا۔ اس لیے ہر شخص کی خواہش تھی کہ اس سے جان چھوٹے۔ مرکزی حکومت کے چیف سیکریٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس کو غالباً وزیراعظم نے اعتماد میں لیا تھا جنہوں نے سکیوریٹی کے بھرپور انتظام کیے تھے اور مرکزی قیادت کو بھی اس سے بے خبر رکھا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ مرکزی ایجنسیوں کو بھی اس اہم معاملہ کی بھنک تک نہ لگی۔ اگر ان کو اس کا پتہ چلتا تو اس سے قبل ہی فاروق حیدر کو برطرف کیا جاتا یا صدر ذوالقرنین صدر آزاد کشمیر

کو باہر نہ جانے دیا جاتا۔ یہ ہماری بیوروکریسی کا کمال ہے یا مرکزی ایجنسیوں کی غفلت تھی یا اعانت، یہ میرے لیے ایک معمہ ہے۔

میں نے اس واقعہ کے بارے میں گھر میں بھی کسی کو اعتماد میں نہیں لیا تھا بلکہ کسی کو اس بات کی بھنک بھی نہیں لگنے دی تھی، حالاں کہ اس دن میری دونوں بیٹیاں اور ان کے بچے بھی گھر پر تھے۔ ان سے میری دوستی ہے اور کسی معاملے میں کوئی راز داری تو دور کی بات بلکہ غیر ضروری حد تک بے تکلفی اور ہمرازی ہے۔ ان کو بہر حال رات گئے تک میرے گھر سے باہر رہنے، جب میں اپنے بھائی کے گھر چیف جسٹس ہائی کورٹ کے ساتھ میٹنگ کے لیے گیا تھا، اگلے روز خلافِ معمول صبح جلدی تیار ہو کر دفتر جانے سے، کچھ حیرانی ہو رہی تھی، لیکن مجھ سے پوچھا کچھ نہیں۔ میں نے گھر سے نکلتے وقت البتہ سب کو کہا تھا کہ دعا کرنا کیوں کہ آج کا دن بہت مشکل اور آزمائش طلب ہے۔ میں نے اس دن موبائل فون بھی بند کر دیا تھا۔ جب لوگوں نے پولیس کی غیر معمولی نقل و حرکت اور مجھے پولیس کی گاڑیوں کے جھرمٹ میں عدالت سے نکلتے ہوئے دیکھا اور یہ افواہ بھی گشت کرنے لگی کہ مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔ میرے گھر والے بہت پریشان ہو گئے، ان کو یقین ہو گیا کہ میرے ساتھ کوئی واردات ہوئی ہے۔ ان دنوں میرے مرکزی حکومت اور اس کی ایجنسیوں کے ساتھ تعلقات بھی کشیدہ تھے۔ میرے بطور قائم مقام چیف جسٹس بننی، ریاض اختر کے خلاف ریفرنس اور اس کی معطلی کی اطلاع میرے گھر والوں اور باقی لوگوں کو تمام قومی نشریاتی اداروں کی خبروں میں بریکنگ نیوز کے ذریعہ سے ملی۔ یہ ناقابل یقین بات تھی۔ میں نے 1 بجے کے بعد اپنا موبائل فون آن کیا اور سب سے پہلے بچیوں کو اس بارے میں اطلاع دی جنہوں نے شکوہ کیا کہ میں نے ان سے راز داری برتی ہے۔ یہ معاملہ ہی ایسا تھا جس میں ایسا کیا جانا لازمی تھا۔ گھر اور اداروں کے معاملات اور سرکاری ذمہ داریوں کے درمیان اگر فرق مٹ جائے تو انتشار پھیلنا یقینی ہے۔ گھر والے، گھریلو اور برادری کے معاملات کی حد تک گھر والے ہوتے ہیں، اس قسم کے حساس معاملات میں ان کو شامل کرنا سنگین بد یانتی ہوتی ہے۔

175

ریاض اختر کے خلاف ریفرنس کیوں ہوا؟

ریاض اختر کے خلاف آئین اور روایات ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بننے پر کوئی خوش نہیں تھا۔ سب لوگ اس کو آئین اور روایات کا قتل سمجھتے تھے۔ ذاتی طور پر کسی اہلیت اور خوبی کا مالک نہیں تھا۔ بیوروکریسی اس کی بچگانہ حرکتوں سے بہت نالاں تھی۔ ہائی کورٹ چیف جسٹس، جنرل انور صدر آزاد کشمیر کی چاپلوسی اور سپریم کورٹ کا فوجی ایجنسیوں کی ملی بھگت سے مسلم کانفرنس کے سردار عتیق خان کو وزیر اعظم بنانے کے لیے الیکشن میں دھاندلی کرنے کے صلے میں بنایا گیا۔ جنرل مشرف ہندوستان کے ساتھ اپنے چار نکاتی فارمولے کو آزاد کشمیر میں عتیق خان، مقبوضہ کشمیر میں عمر فاروق، عمر عبداللہ اور محبوبہ مفتی کے ذریعہ Sale کرنا چاہتا تھا۔ میں اس فارمولے میں فٹ نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ ایک میٹنگ میں مَیں نے اس پر تنقید بھی کی تھی۔ اس لیے عتیق خان اس راستہ میں حائل کسی رکاوٹ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ عام لوگوں کو اس وجہ سے بھی ریاض اختر کے خلاف نفرت تھی، لیکن اس کی خصوصی وجہ عتیق خان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک اور راجہ فاروق حیدر خان کے وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد پیدا ہوئی جب عتیق خان نے فاروق حیدر سے انتقام لینے کے لیے ریاض اختر کے ذریعہ انہیں اور شاہ غلام قادر کو جو اس وقت اسمبلی کے سپیکر تھے، کو نااہل قرار دلوانے کی سازش شروع کی۔ ان دنوں ان دونوں کے خلاف غالباً الیکشن پٹیشن بھی کسی عدالت کے زیر سماعت تھی جس کو گھیر گھار کے ریاض اختر اپنے پاس منگوا سکتا تھا۔ یا از خود جعلی مانیٹرنگ سیل میں کارروائی کر کے ان کو نااہل قرار دیتا۔ وہ ایک مہم جو انسان تھا، کچھ بھی کر سکتا تھا۔ راجہ فاروق حیدر خان کو ایجنسیاں بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس خدشہ کی پیش بندی کے طور فاروق حیدر خان اور شاہ غلام قادر کے مفادات مشترک تھے اور دونوں اس طاق میں تھے کہ ریاض اختر کے خلاف عوام، وکلاء اور بیوروکریسی کے غم و غصہ کی حمایت کے پس منظر میں اس کو فکس اَپ کریں۔ راجہ ذوالقرنین صدر ریاست کو بیرون ملک دورے پر جانے کے لیے بھی انہوں نے facilitate کیا۔ اس طرح شاہ غلام قادر صاحب قائم مقام صدر بن گئے۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر راجہ ذوالقرنین کے بیرون ملک جانے کے دوسرے ہی دن ریاض اختر کے خلاف ریفرنس دائر

کر دیا۔ اس میں ان کا میرے لیے ہمدردی کا کوئی عنصر نہیں تھا کیوں کہ جب اس کو چیف جسٹس بنایا گیا، انہوں نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

میرا گمان ہے کہ ریفرنس کی دائری کے عمل میں کسی نہ کسی سطح پر ایجنسیوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی کیوں کہ تمام تر ہمدردیوں اور سازشوں کے باوجود وہ لوگ بھی ریاض اختر کی بچگانہ حرکتوں پر شرمندہ تھے، جن کا اظہار کچھ ذمہ دار لوگوں نے میرے ساتھ بھی کیا۔ سردار عبدالقیوم خان کے مکتب سے تربیت یافتہ کوئی بھی شخص ان کی خوشنودی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ جب ریاض اختر کو پہلے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ کا چیف جسٹس خلاف آئین بنایا گیا نہ صرف ان حضرات نے، بلکہ سوائے خالد ابراہیم کے، کسی سیاست دان نے مذمت یا مزاحمت نہیں کی، لیکن اپنے مفادات کو زک پہنچنے کے اندیشے کی وجہ سے موقع ملنے پر فوری طور وار کیا۔ بات خلوص کی ہوتی تو خواجہ شہاد احمد اور چوہدری اعظم خان کو بھی جج نہ بننے دیا گیا ہوتا جن کے خلاف اکثر الزامات وہی تھے جن کا مرتکب ریاض اختر پایا گیا تھا۔ اور اس کی اطلاع حکومت کو بذریعہ مکتوب بھی دی گئی تھی۔ بہرحال قومی، ملکی اور ادارے کے مفاد میں بہترین کام ہو گیا۔

بطور قائم مقام چیف جسٹس سپریم کورٹ ریفرنس کی سماعت

میں نے حلف لینے کے بعد دفتر واپس آ کر سب سے پہلے ملازمین کو بلا کر نئی صورتِ حال کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی تلقین کی۔ لوگ سہمے ہوئے تھے، ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ ریاض اختر صاحب کے طرزِ عمل سے نہ صرف بہت تنگ تھے بلکہ اس سے جان چھڑانے کے لیے ہر وقت دعا گو بھی رہتے تھے لیکن ان کے خوف میں اتنے مبتلا تھے کہ ان میں سے کوئی مجھے گھر پر تو کیا، چیمبر میں بھی ملنے نہیں آتا تھا۔ میں نے ان کو سب سے پہلے انتظامی معاملات میں ایک دوسرے کے خلاف اپیلوں کے معاملات نکال کر پیش کرنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ہی ریاض اختر اور ہائی کورٹ کے دیگر ججوں کے خلاف متدائرہ پٹیشنز جو ریاض اختر نے ضبط کر کے سپرنٹنڈنٹ کے سیف میں رکھی

تھیں، کو نکال کر واپس ہائی کورٹ میں کارروائی کے لیے بھیجا کیوں کہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے بغیر ان کو سپریم کورٹ میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ہائی کورٹ کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ جتنی جلدی ہو سکے ان کا فیصلہ کیا جائے۔ ان پٹیشنز میں ریاض اختر چوہدری کی بطور چیف جسٹس تقرری، خواجہ شہاد احمد کی بحیثیت جج سپریم کورٹ اور محمد یونس طاہر اور رفیع اللہ سلطانی کی بحیثیت جج ہائی کورٹ تقرریاں شامل تھیں۔ محمد یونس طاہر اور رفیع اللہ سلطانی کی پٹیشنز میں ان کو کام کرنے سے بھی روک دیا گیا کیوں کہ ان کی سرگرمیاں ایک عام سیاسی کارکن کی طرح ہو گئی تھیں جو ادارے کے وقار کے سراسر خلاف کام کر رہے تھے۔ قانونی طور پر بھی ایسا ہونا ناگزیر تھا کیوں کہ ان کی تقرری کا کسی دفتر میں کوئی ریکارڈ نہیں تھا، سوائے اس ایڈوائس کے جو کہ وزیراعظم پاکستان کے دفتر سے جاری کی گئی تھی۔ ریاض اختر صاحب نے ان کے کیسز بدوں اختیار ان کو بلیک میل کرنے کے لیے دبا رکھے تھے۔

دفتری معاملات میں تمام ملازموں کی ایک دوسرے کے خلاف اپیلوں کا ایک دن کی سماعت کے بعد فیصلہ کیا اور ہر ملازم کو اس کی سنیارٹی اور حیثیت کے مطابق ترقی یا تنزلی کی گئی۔ سارے لوگ اس فیصلے سے مطمئن ہو گئے اور یکسوئی سے کام کرنے لگے۔ عدالت کی عمارت زلزلہ کے بعد گندگی اور بے ڈھنگے پن کا شکار ہو گئی تھی، چھت ٹپکتی تھی جس کے لیے محکمہ تعمیرات عامہ سے فوری صفائی، رنگ وروغن اور چھت کی مرمت کا کام کروایا گیا۔ چند دنوں میں عمارت کی لُک میں فرق محسوس ہونے لگا۔ ان اقدامات سے لوگوں کا اعتماد بحال ہو گیا۔ ریاض اختر کے وقت مانیٹرنگ سیل، بدنامِ زمانہ کارروائی کو بند کیا گیا جس کے ذریعہ سرکاری ملازمین اور ان لوگوں کی توہین کی جاتی اور بلیک میلنگ کی جاتی تھی جن سے ریاض اختر اور اس کے حواری اپنا کام کاج کروانا چاہتے تھے۔ سرکاری ملازمین نے اس سے سکھ کا سانس لیا اور اور سرکاری دفتروں میں کام کاج اطمینان سے ہونے لگا۔

ادھر ریاض اختر کے خلاف ریفرنس کی سماعت جاری رکھی گئی۔ موصوف نوٹس وصول کرنے کے باوجود پیش نہیں ہوئے بلکہ میرپور کے مقام پر دفتر میں جا کر ملازمین سے بدتمیزی کی اور اپنے حامی وکلاء اور دکان داروں سے جلسے جلوس اور متوازی جوڈیشل کونسل کا تاثر دینا شروع کیا۔ صدر ریاست

راجہ ذوالقرنین خان جو آٹھ ہفتے کے لیے انگلینڈ کے دورے پر گئے تھے، اپنا دورہ مختصر کر کے 15 اپریل کو واپس وطن آ گئے۔ ان سے پہلے سے تیار شدہ نوٹس (Notes) پر دستخط کروائے جن کے تحت ریاض اختر کے خلاف ریفرنس کی واپسی اور چوہدری محمد اعظم خان کی بحالی کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ابراہیم ضیا کی برطرفی کے احکامات بھی تھے۔ اس نوٹ کی کاپیاں ان لوگوں کو بھی دی گئیں۔ ان نوٹس کے پڑھنے سے لگتا ہے کہ وہ جسٹس خواجہ شہادا حمد اور جسٹس محمد اعظم خان کے تحریر کردہ ہیں۔ زبان اور الفاظ ان کے ہی تھے۔

15 اپریل کی شام کو سپریم کورٹ کے رجسٹرار فاضل ہاشمی اور سپرنٹنڈنٹ عبدالحمید راٹھور نے سپریم کورٹ کے سارے ریکارڈ پر قبضہ کر لیا۔ جو لوگ میرے ساتھ تعاون کرتے تھے، ان کو دفتر سے نکال دیا، اس سے ایک ڈراؤنی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ میں فوری طور پر سپریم کورٹ چلا گیا اور انتظامیہ کی مدد سے ان دونوں اور ان کے ہمراہ ایک کلرک کو بلڈنگ سے باہر نکلوا دیا۔ یہ دونوں لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد توسیع ملازمت کے باعث نوکری میں تھے جن کا بقیہ مدت ملازمت میں نے ختم کر کے ان کی جگہ نئے لوگوں کو ذمہ داریاں دے دیں۔ سپریم کورٹ کا پروٹوکول افسر جو بھی اس سازش میں شامل تھا، کو غیر معقول طرزِ عمل کی وجہ سے پروبیشن مدت کے اندر ہونے کی وجہ سے نکال دیا۔ اس سے ملازمین پر رعب طاری ہو گیا اور کام کاج میں باقاعدگی اور نظم وضبط پیدا ہو گیا۔ میری قطعاً یہ خواہش نہیں تھی کہ کسی ملازم کو کسی بھی طرح ڈسٹرب کیا جاتا کیوں کہ ملازمین کا قبلہ ان کا سربراہ ہوتا ہے جس کی پالیسی پر وہ چلتے ہیں۔ لیکن جب اکٹھے چلنا مشکل ہو جائے تو سختی کرنا ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ناسور کا واحد علاج اس کی سرجری ہوتی ہے۔ اس کے بعد سارے معاملات ٹھیک ہو گئے۔ اگر میرا ان ملازمین کو نکالنے کا ارادہ ہوتا تو پہلے دن ہی نکال دیتا۔

ریفرنس کی سماعت کے دوران اخباری بیانات کا نوٹس لیتے ہوئے سپریم جوڈیشل کونسل نے صدارتی سیکریٹریٹ کو ہدایت جاری کی کہ وہ تمام ریکارڈ پیش کیا جائے جس کے تحت مبینہ طور پر صدر نے ریاض اختر کے خلاف ریفرنس واپس لیا، غلام مصطفیٰ مغل چیف جسٹس ہائی کورٹ اور میرے خلاف

ریفرنس دائر کرنے کی ہدایت کرنے کے علاوہ، یونس طاہر کو قائم مقام چیف جسٹس[175] ہائی کورٹ مقرر کیا ہے اور چوہدری محمد اعظم خان برطرف شدہ ایڈہاک جج کو بحال اور محمد ابراہیم ضیا کو برطرف کیا ہے۔ ایڈیشنل سیکریٹری مدحت اکرم نے دوبار مہلت لینے کے باوجود ریکارڈ پیش نہیں کیا۔ ان لوگوں کو خدشہ تھا کہ سپریم جوڈیشل کونسل صدر ذوالقرنین کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی شروع کر دے گی جس کا عندیہ ہم نے سماعت کے دوران دیا تھا کہ آئین میں درج توہین عدالت کی کارروائی کا اطلاق ہر ایک پر ہوتا ہے اور صدر کو بھی کوئی استثنیٰ حاصل نہیں ہے۔ ان کے خلاف وکلا کی جانب سے توہین عدالت کی درخواست بھی دائر ہوئی تھی جو کونسل کے زیر سماعت تھی۔ سپریم جوڈیشل کونسل نے کارروائی کو کھلی عدالت میں چلانے کا اہتمام کیا تھا جس کی کوریج الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کرتا تھا۔ وکلا، علمائے کرام اور عام لوگوں نے اپنے اپنے بیانات ریکارڈ کرائے اور ریفرنس میں شامل نکات پر اپنا اپنا موقف پیش کیا۔

ریفرنس کے خاص خاص نکات یہ تھے کہ ریاض اختر نے بطور چیف جسٹس اپنی حدود سے ماورا انتظامی حکم کے تحت مانیٹرنگ سیل قائم کیا جہاں لوگوں کو بلیک میل کیا جاتا ہے اور سپریم کورٹ پاکستان کے خلاف حکم امتناعی جاری کر کے آزاد کشمیر کو ایک الگ ملک قرار دیا۔ اپنی بیٹی کے میٹرک کے امتحان کے پرچوں میں بورڈ کے چیئرمین کو مانیٹرنگ سیل کے ذریعہ ڈرا دھمکا کر نمبروں میں اضافہ کروایا۔ اپنے بیٹے کو دباؤ کے تحت حکومت میں خلافِ قواعد گزیٹیڈ نوکری دلوائی۔ اپنے ایک فیصلے میں انبیا کو غلط کاریوں کا مرتکب ہونے کے عقیدے کا اظہار کیا وغیرہ۔ یہ سارے الزامات دستاویزات کے ساتھ ثابت تھے جن کا دفاع کرنا بھی ریاض اختر کے لیے مشکل تھا، اس لیے انہوں نے کارروائی سے لاتعلقی اختیار کرنے میں عافیت سمجھی۔ جسٹس اعظم خان، ریاض اختر کی برطرفی اور اپنے جج بننے کے بعد یہ کریڈٹ لینے کی کوشش کرتے رہے کہ انہوں نے ریاض اختر کو برطرف کروانے میں بھرپور کردار ادا کیا جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ساری جعلی کارروائی میں وہ برابر کے شریک تھے۔

جوڈیشل کونسل نے فیئر ٹرائل کا ہر ممکن اہتمام کیا۔ گو کہ بظاہر میرا ریاض اختر کے ساتھ مفادات کا ٹکراؤ تھا جس کی بنا پر اعتراض کیا جا سکتا تھا کہ میں بنچ میں نہ بیٹھوں لیکن ریفرنس میں ریاض

اختر کی تقرری کا کوئی معاملہ زیر بحث نہیں تھا کہ جس میں فیصلہ کرنا مقصود ہوتا۔ دوسرا، اگر میں بھی بنچ میں نہ بیٹھتا تو دوسرے سینئر جج خواجہ شہاد احمد تھے جن کی بیٹی کی شادی ریاض اختر کے بیٹے سے ہوئی تھی اور انہوں نے بنچ میں بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر ریاض اختر چیف جسٹس رہتے، میں پھر بھی سینئر جج ہی رہتا اور اگر وہ برطرف ہو جاتے تو میں نے پھر بھی چیف جسٹس بننا تھا۔ سہولت اور انصاف کے تقاضے اس کی سماعت کو موخر کرنے میں نہیں تھے۔ میں نے یوں بھی محض چند دن کے بعد ریٹائر ہو جانا تھا۔ اس صورت میں یہ ریفرنس بے معنی ہو جاتا اور ان تمام الزامات کے ساتھ وہ اس عہدے پر قائم رہتے جو قانون اور انصاف کی منشا کے مغائر تھا۔

ریاض اختر صاحب کو موقع ملنے کے باوجود انہوں نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ یہ سارے حالات ایسے تھے کہ ریفرنس کا سماعت نہ کیا جانا حالات کو اور گمبھیر بنا دیتا۔ ایک طرف ایک شخص کا ذاتی مفاد تھا کہ وہ عہدے پر رہے، دوسری طرف پورے نظام کا اس کے خلاف ٹھوس ثبوت کے ساتھ الزامات تھے۔ عوامی مفاد بہر حال ذاتی مفاد پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میرا اور ریاض اختر کا ہونا نہ ہونا بے معنی بات ہے، اصل معاملہ ریاست اور ریاستی اداروں کا ہے۔ میں نے یہ بات برملا کی تھی کہ اگر ریاض اختر کی برطرفی ہو جاتی ہے تو میں اسی روز استعفیٰ دے دوں گا کیوں کہ اس کے بعد میرا ذاتی مفاد شامل ہو جاتا۔ اس وقت کے لوگوں، بالخصوص وکلا سے کسی بھی وقت کوئی بھی پوچھ سکتا ہے کہ کیا ان کے طرزِ عمل کی وجہ سے یہ کارروائی اور برطرفی جائز تھی یا ناجائز؟ ان کا جواب ہی اس کارروائی کے جائز یا ناجائز ہونے کا جواز ہوگا۔ ان کا چیف جسٹس رہنا ادارے اور قوم کے مفاد کے خلاف تھا، اس لیے ریفرنس کا فیصلہ ناگزیر تھا۔ ہم نے کارروائی مکمل کر کے آئین کے مطابق 12 اپریل 2010 کو اپنی رپورٹ اس سفارش کے ساتھ چیئرمین کونسل، وزیر اعظم پاکستان کو بھیج دی کہ چیف جسٹس بد دیانتی کا مرتکب ثابت ہوا ہے، اس کو برطرف کیا جائے۔ یہ رپورٹ پرائم منسٹر سیکریٹریٹ میں نرگس سیٹھی ایڈیشنل سیکریٹری نے وصول کی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ایک فرضی رپورٹ ریاض اختر، خواجہ شہاد اور یونس طاہر کی جانب سے

مبینہ طور پر میرے اور غلام مصطفیٰ مغل کے خلاف وزیر اعظم پاکستان کو صدر ذوالقرنین کے ذریعہ بھیجی گئی۔ اور مبینہ طور پر یہ ظاہر کیا گیا کہ صدر کی جانب سے ہمارے خلاف متدائرہ ریفرنس میں کارروائی کے بعد ہماری برطرفی کی رپورٹ ہے۔ حالاں کہ نہ تو صدر نے ایسا کوئی ریفرنس دائر کیا تھا نہ اس سارے عرصہ کے دوران یہ لوگ کسی جگہ کسی دفتر یا عدالت میں بیٹھے اور نہ ہی کوئی کارروائی ہوئی۔ یہ ایک ٹوپی ڈرامہ تھا جو صدر آزاد کشمیر، عتیق احمد خان، منظور وٹو، ملٹری انٹیلی جینس، آئی ایس آئی، وزیر اعظم پاکستان، کچھ مقامی ریٹائرڈ، حاضر سروس ججوں جن میں چوہدری محمد اعظم خان صاحب اور خواجہ شہاد شامل ہیں، کی ملی بھگت سے رچایا گیا تھا تاکہ وزیر اعظم پاکستان سپریم جوڈیشل کونسل کی سفارشات پر عمل نہ کر سکے۔ ان لوگوں کا اس میں شامل ہونا اس لیے یقینی پایا جاتا ہے کہ اس سے سپریم کورٹ میں ریاض اختر کی جانب سے اپیل میں میری درخواست کے باوجود چوہدری محمد اعظم چیف جسٹس نے وہ ریکارڈ طلب نہیں کیا، جس کی رو سے میرے اور جسٹس غلام مصطفیٰ مغل کے خلاف ریفرنس اور سپریم جوڈیشل کونسل کی رپورٹ وزیر اعظم پاکستان کو بھجوائی گئی تھی اور نہ ہی چوہدری ابراہیم صاحب کی برطرفی اور ریاض اختر اور چوہدری اعظم صاحب کی بحالی کا مبینہ طور حکم جاری کیا گیا تھا، جس کا سپریم کورٹ میں کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ جسٹس چوہدری اعظم صاحب کی پوزیشن اس فارسی محاورے کی طرح ہے کہ: یکے دزد باشد و گر پردہ دار۔

آئین کے تحت وزیر اعظم پر لازم تھا کہ رپورٹ کے موصول ہوتے ہی صدر آزاد کشمیر کو ایڈوائس جاری کرتے کہ ریاض اختر کی برطرفی کا نوٹیفکیشن جاری کیا جائے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب آزاد کشمیر کی حکومت اور عدلیہ نے حکومت پاکستان کی نہ صرف مرضی کے خلاف بلکہ اس کی مزاحمت اور مخالفت کے باوجود اس کی ساری ایجنسیوں کی مرضی کے خلاف یہ کام کیا۔ یہ ان کو ہضم نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وزیر اعظم پاکستان نے اٹارنی جنرل مولوی انوار الحق کے ذریعہ اس رپورٹ پر عمل نہ کرنے پر نئی سپریم جوڈیشل کونسل تشکیل دینے کی رائے حاصل کی اور رپورٹ اور سفارشات کو نظر انداز کرتے ہوئے خواجہ شہاد احمد کی سربراہی میں مبینہ طور پر نئی کونسل تشکیل دینے کی ہدایت کی،

جووزیراعظم سیکریٹریٹ اور آئی ایس آئی ہیڈکوارٹر کے درمیان ہی رہی۔تاہم ریاض اختر چوہدری صاحب کی سپریم کورٹ آزاد کشمیر میں ایک اپیل میں ان کی فوٹو کاپیاں پیش کی گئیں جو غیر مصدقہ ہیں، جس کی نقل بطور ضمیمہ شامل ہے۔ یہ ساری جعلی اور فرضی کارروائی ہے جس کا کوئی ریکارڈ اور پتہ نہیں ہے۔

میں نے ان غیر مصدقہ لیکن فوٹو کاپیوں کی انکوائری اور راجہ ذوالقرنین، سید یوسف رضا گیلانی اور رجسٹرار سپریم کورٹ کو ان جعلی دستاویزات کی فائلز، اگر کوئی ہیں، کو طلب کرنے کی درخواست بھی دی۔لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی حالاں کہ یہ ریاستی سطح کی جعل سازی سب سے بڑے لیول پر اور سب سے بڑی عدالت میں کی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس محمد اعظم خان اس کارروائی میں بھرپور شامل تھے، اس لیے اس پر کوئی شنوائی نہیں ہوئی کیوں کہ اس وقت ان سب کا مفاد مشترک تھا۔اس جعلسازی کو نظرانداز کرنا بددیانتی اور بدمعاملگی کی انتہا ہے۔ اگرچہ گڑے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا لیکن حقیقت طشت از بام ہوجاتی۔ اس کارروائی کے دوران درخواست کے باوجود جسٹس ابراہیم ضیا کو خدشات ہائے دوردراز کے پیش نظر بنچ میں شامل نہیں کیا گیا۔ جبکہ چیف جسٹس محمد اعظم خان جن کے بارے میں سپریم جوڈیشل کونسل نے ریمارکس بھی دیئے تھے، خود اس کی سماعت کرتے رہے جبکہ دوسرا جج بھی موجود تھا۔

ڈی جی آئی ایس آئی اور فاروق حیدر

10 مئی 2010 کو راجہ فاروق حیدر خان وزیراعظم کے پاس جنرل ظہیرالسلام جو اس وقت آئی ایس آئی ہیڈکوارٹر میں ڈپٹی ڈی جی آئی ایس آئی اور پھر ڈی جی بنے، وزیراعظم پاکستان کا وہ حکم لے آئے جس کے تحت جوڈیشل کونسل کی سفارشات کے برعکس نئی کونسل تشکیل دی گئی تھی۔ فاروق حیدر نے کمال ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ وزیراعظم کا حکم آزاد کشمیر کے آئین کے خلاف ہے اس پر عمل میری لاش پر سے گزر کر ہوسکتا ہے۔اس پر جنرل سہم گیا۔کسی جنرل نے اپنی کتاب میں

لکھا ہے کہ اگر فوجی پروار کرنے میں پہل کی جائے تو سنبھل نہیں سکتا۔اس کے مصداق جنرل ظہیر کو کچھ نہ بن پڑی تو وہ مبینہ طور پر وہاں پر موجود آزاد کشمیر میں انچارج کرنل گوندل پر برس پڑے اور راجہ ذوالقرنین کو گالیاں دینا شروع کیں۔ فاروق حیدر کے خیال میں اس کو باور کرایا گیا تھا کہ جونہی فاروق حیدر کو وزیراعظم کا نوٹ دیا جائے گا، وہ سہم کر اس کو قبول کرلے گا۔ایسا نہ ہونے کی وجہ سے بحران اور شدید ہوگیا۔ بقول فاروق حیدر جنرل نے صدر ذوالقرنین کو بلا کر لانے کو کہا لیکن فاروق حیدر نے حفظ مراتب کے تقاضے کے پیش نظر اس کے پاس جانے کی تجویز دی۔ یہ سب کچھ اسلام آباد کشمیر ہاؤس میں ہوا۔ یہ سارے لوگ صدر ذوالقرنین کے پاس چلے گئے جہاں پر بھی بقول فاروق حیدر تلخی کا ماحول تھا لیکن فاروق حیدر نے کہا کہ وہ اس غیر قانونی حکم کو نہیں مانیں گے۔ اس پر تجویز کیا گیا کہ یہ سارا ڈرامہ ریاض اختر صاحب کے استعفیٰ سے ختم ہوسکتا ہے۔اس کے بعد میرپور میں تعینات آئی ایس آئی کے کرنل کو کہا گیا کہ وہ اگلے روز گیارہ بجے ریاض اختر کو اسلام آباد آئی ایس آئی ہیڈکوارٹر میں لے آئے۔ایسا ہی ہوا۔

یہ بہت افسوس ناک اور قابل مذمت واقعہ تھا کیوں کہ آزاد کشمیر کی حیثیت کو وزیراعظم پاکستان اور اس کی ایجنسیوں نے مسترد کردیا۔اس لیے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ آزاد کشمیر نہ آزاد ہے اور نہ ہی کشمیر۔اس واقعہ کا دفاع تو نہیں کیا جاسکتا لیکن ایک انگریزی ضرب المثل: "when going gets tough, tough gets going" کی مصداق ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو کسی کو لے آتے ہیں، وہ واپس لینے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آئی ایس آئی ہیڈکوارٹر میں راجہ ذوالقرنین، فاروق حیدر اور سردار عتیق خان کی موجودگی میں جنرل ظہیر کے حکم پر ریاض اختر کو پہلے سے تیار شدہ استعفیٰ کی تحریر پکڑائی۔ ریاض اختر نے ذوالقرنین اور عتیق خان کی طرف دیکھ کر ان سے رہنمائی چاہی جنہوں نے کہا، ''کردو چوہدری صاحب، دستخط کردو'' اور اس کے دستخطوں کے بعد اس ڈرامے کا اختتام ہوگیا جو خلافِ آئین، روایات اور اخلاقی جواز کے ریاض اختر کی بطور چیف جسٹس تقرری سے شروع ہوا تھا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدی۔۔۔

جنرل ظہیر السلام، ریاض اختر کے چیف جسٹس بنائے جانے کے وقت مری ڈویژن کے GOC تھے جو 2006 کے جعلی الیکشن میں بھی ریاض اختر اور عتیق خان کی پشت پر تھے اور ریاض اختر کو چیف جسٹس بنانے میں بھی معاون۔ بعد ازاں یہ بطور ڈی جی آئی ایس آئی بے انتہا بدنام ہو کر ریٹائر ہوئے۔ بہت ہی افسوس ناک بات ہے کہ چند مہم جو لوگوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے ادارے بدنام ہو جاتے ہیں جن کے 99 فیصد لوگوں کو اس کی علمیت اور نہ ہی اس میں دلچسپی ہوتی ہے، صرف باس کو خوش کرنے کے لیے چند لوگ اچھل کود شروع کر دیتے ہیں۔

موصوف نے استعفیٰ تو 11 مئی 2010 کو دیا لیکن اس پر تاریخ 6 مئی کی ڈالی جس کے پس پردہ بھی ایک فراڈ تھا لیکن اس سے مجھے بہت فائدہ ملا۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ ریاض اختر کو تمام سہارے نہ بچا سکے اور مجھے تمام مخالف نہ ہٹا سکے۔ یہ میرے اللہ کی شان ہے۔

ریاض اختر صاحب کی پرانی تاریخ میں استعفیٰ دینے کی وجہ یہ بنی کہ ان کے خلاف جورٹ سماعت کے لیے ہائی کورٹ کو بھیجی گئی تھی، ہائی کورٹ نے 7 مئی کو اس کا فیصلہ سنایا جس میں لکھا گیا تھا کہ ''چوں کہ سپریم جوڈیشل کونسل نے ریاض اختر کی برطرفی کی سفارش کر دی ہے، اس لیے وہ اس تاریخ سے برطرف تصور ہوں گے، قطع نظر اس بات کے کہ صدر ان کی برطرفی کا نوٹیفکیشن کب جاری کرتے ہیں یا نہیں، اس لیے اس رٹ میں ان کی برطرفی فضول مشق ہوگی حالاں کہ اس کی تقرری غیر آئینی ہی ہے۔'' یہ فیصلہ چیف جسٹس ہائی کورٹ غلام مصطفیٰ مغل صاحب نے کیا جو قانونی جریدہ PLD 2010 HC 47 (AJK) میں رپورٹ ہوا ہے جس میں اس معاملے کی ساری داستان درج کی گئی ہے۔ ریاض اختر صاحب نے اس فیصلے کے اثرات سے بچنے کے لیے 5 دن پہلے کی تاریخ میں استعفیٰ دے دیا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ قطع نظر اس تاریخ سے جب میں قائم مقام چیف جسٹس بنا تھا۔ 6 مئی 2010 کے بعد میں ایک مکمل خالی اسامی کے خلاف تعینات رہا جس نے بعد ازاں میری پنشن وغیرہ کے معاملات کو یکسو کر کے مجھے چیف جسٹس کی پنشن کا مستحق بنایا۔ ریاض اختر کا استعفیٰ مجھے ایوان صدر اسلام آباد سے بذریعہ فیکس موصول ہوا اور اس کے ساتھ ہی استعفیٰ کی منظوری کا نوٹیفکیشن بھی ملا۔

میرے استعفیٰ کی وجوہات

ریاض اختر کے استعفیٰ کے بعد میرے لیے یہ اخلاقی سوال پیدا ہو گیا جو میں نے پہلے سے کہا تھا کہ اگر ریاض اختر عدالتی کارروائی کی پاداش میں برطرف ہو جاتے ہیں، تو میں خود بھی استعفیٰ دے دوں گا، وگرنہ اس کے خلاف میری کارروائی میں شمولیت ذاتی غرض اور بد نیتی پر مبنی ہوتی۔ چوں کہ ان کی ریٹائرمنٹ استعفیٰ کی وجہ سے ہوئی، اس لیے میرے لیے یہ جواز بن گیا تھا کہ میں اپنے کہنے سے مکر جاؤں۔ لیکن بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے رہنے سے بہت خرابی پیدا ہونے کا امکان ہے کیوں کہ میں نے کچھ ایسے آئینی کام کرنے تھے، جو ناگزیر تھے گو کہ ان کے دوررس اثرات مرتب ہوتے لیکن ادارے نہ سہ سکتے تھے۔ مثلاً خواجہ شہاد احمد چیف جسٹس کی برطرفی یقینی ہو جاتی کیوں کہ ان کی تقرری ویسی ہی غیر آئینی تھی، جیسی کہ ہائی کورٹ سے برطرف شدہ ججوں محمد یونس طاہر اور رفیع اللہ سلطانی کی تھی۔ ان تینوں حضرات کی تقرری کی ایڈوائس کاغذ کے ٹکڑے پر بغیر کسی سپورٹنگ ریکارڈ کے تھی۔ اس کے علاوہ راجہ ذوالقرنین صدر ریاست کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی بھی ناگزیر ہو جاتی، اس سے میرا اپنا وجود بھی متنازع بن جاتا، جو نہایت ہی مختصر عرصہ میں عدلیہ کی تطہیر کے بعد ایک افسانوی کردار بن گیا تھا اور نیک نامی میں اپنے عروج پر تھا۔ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ ریاض اختر سے استعفیٰ واپس کروا کر میری ریٹائرمنٹ کا انتظار کیا جاتا اور ریاض اختر کو دوبارہ چیف جسٹس بنایا جاتا۔ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ خود کو شرافت سے علیحدہ کر لوں، باقی معاملات حالات خود سنبھال لیں گے۔ حالاں کہ میری ریٹائرمنٹ کے چند ہی دن رہ گئے تھے۔ اسی روز فاروق حیدر نے ریاض اختر کے استعفیٰ کے بعد مجھ سے بات کی۔ راجہ عباس سیکریٹری قانون نے بھی مجھ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے اس ساری کارروائی سے مجھے باخبر بھی رکھا تھا اور اس کا ریکارڈ بھی فیکس کیا تھا۔ فاروق صاحب نے جب مجھے کہا کہ پیر صاحب آپ کا کیا ارادہ ہے تو میں نے ان کو اپنے قول وقرار کے مطابق کہہ دیا کہ میں صدر کو استعفیٰ فیکس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد سپریم کورٹ میں موجود واحد

مستقل جج خواجہ شہاد احمد رہ گئے تھے جن کی تقرری کا نوٹیفیکیشن بطور چیف جسٹس بھی جاری ہو گیا۔

میں اس رات اسلام آباد کشمیر ہاؤس میں چلا گیا جہاں مسلم کانفرنس کے پارلیمنٹری پارٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میری وہاں پہنچنے کی خبر سنتے ہی عتیق خان وہاں سے نکلے جس کو چھوڑنے کے لیے فاروق حیدر سمیت باقی لوگ باہر آ رہے تھے کہ میری سیڑھیوں پر ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے فاروق حیدر کو مبارک دی جس پر عتیق خان نے کہا سب کو مبارک ہو۔ اسی شام خواجہ شہاد احمد کا حلف بھی ہو گیا جو مجھے کشمیر ہاؤس میں ملنے آئے۔ میں نے ان کو وہاں مبارک دی اور اور پولیس سکواڈ جو میرے ساتھ آیا تھا، اس کے حوالے کر کے اس کا ملاقات پر شکریہ ادا کیا۔ مجھے وکلاء اور سول سوسائٹی نے غیر معمولی عزت سے نوازا، جس پر میں اللہ اور ان کا شکر گزار ہوں۔ اس طرح ان کرائسسز کا اختتام ہو گیا۔

پنشن

میری مستقل چیف جسٹس بننے کی ایڈوائس چیئرمین کشمیر کونسل نے بھیجنی تھی، جو نہیں بھیجی گئی۔ بہ ایں ہمہ میں استعفیٰ کی تاریخ تک ایک مستقل خالی اسامی کے خلاف بطور ایکٹنگ چیف جسٹس تعینات رہا۔ مالی ضوابطہ اور اعلیٰ عدالتوں کی پریکٹس اور فیصلوں کے مطابق میں اس منصب کی پنشن کا مستحق تھا جس سے میں ریٹائر ہوا تھا۔ حالات بھی موافق تھے، حکومت بھی ہم خیال تھی اور بیوروکریسی بھی، اس وجہ سے حکومت نے میری پنشن بطور چیف جسٹس جاری کی اور یہی قانونی پوزیشن تھی۔ لیکن جب فاروق حیدر کی حکومت کو عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعہ سردار عتیق احمد خان نے ہٹا کر دوبارہ 29 جولائی 2010 کو حکومت سنبھالی تو اس کے وزیر قانون سیاب خالد حسب سابق مقرر ہوئے۔ سردار سیاب خالد کے ساتھ میرا کافی پرانا بدمزگی کا ریکارڈ ہے، وہ یوں کہ انہوں نے 1991 کی حکومت کے دوران اس وقت کے سیکریٹری قانون محمد صدیق فاروقی کے ساتھ مل کر ایک پہاڑ کو یونیورسٹی کے ذریعہ ایکوائر کروا کر معاوضہ طلب کیا۔ میں نے یونیورسٹی کی رٹ پٹیشن پر ان کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے لکھا

کہ ''قومی خزانہ کوئی ریوڑی کی دکان نہیں ہے کہ خیراتی طور پر بانٹا جائے۔'' اس کی وجہ سے یہ لوگ 80 لاکھ روپے سے محروم ہو گئے جو آج کے آٹھ کروڑ کے برابر ہیں۔ اس عداوت کی بنا پر سیاب خالد نے بحیثیت وزیر قانون میری پنشن بحیثیت جج جاری کرنے اور جو رقم میں نے زائد وصول کی تھی، وہ واپس کرنے کا حکم لکھا۔

اس سازش میں عتیق خان وزیر اعظم اور ریاض اختر بھی شامل تھے۔ میں نے اس حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر کے اس کو معطل کروایا۔ بعد ازاں ہائی کورٹ کے فل بنچ نے پٹیشن کا فیصلہ بھی میرے حق میں کیا جس میں پاکستان کی جیوڈیشری سے متعدد مثالوں کے علاوہ متعلقہ آئینی اور قانونی حوالہ جات کے ذریعہ قرار دیا کہ قائم مقام چیف جسٹس ریٹائرمنٹ اور دیگر مالی مفادات بطور چیف جسٹس لینے کا حق دار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وزیر قانون سردار محمد نواز خان کی پنشن بطور چیف جسٹس بند کروا دی تھی۔ انہوں نے بھی اس حکم کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ دونوں مقدمات کا فیصلہ ایک ساتھ فل بنچ نے کیا جس کو جسٹس آفتاب علوی نے تحریر کیا تھا۔

قائم مقام چیف جسٹس وہ سارے اختیارات استعمال کر سکتا ہے جو مستقل چیف جسٹس کرتا ہے۔ یہ محض ایک انتظامی حربہ ہے تا کہ چیف جسٹس کو دبا کر حکومت کے حق میں نرم رہنے کے لیے راہ ہموار رکھی جائے۔ مستقل چیف جسٹس کی تقرری کے طریقہ میں صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ اس کی تقرری کونسل کی ایڈوائس پر ہوتی ہے جبکہ قائم مقام چیف جسٹس کی تقرری کے لیے ایسا ضروری نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ عمل بھی آئین کی رو کے خلاف ہے، لیکن الفاظ وہ نہیں ہیں۔

ادارے کو استحکام دینے کی خاطر میں نے ریاض اختر کے چیف جسٹس بننے پر ابتدائی دنوں میں ہی، ان کو اور ان کے حامیوں کو کہا تھا کہ وہ چھٹی پر چلے جائیں تا کہ اس عرصہ کے دوران میں قائم مقام چیف جسٹس بن کر ریٹائرمنٹ لے لوں۔ انہوں نے اس وقت اگر مان لیا ہوتا تو میرے بعد بھی وہ 2016 تک چیف جسٹس رہتے لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کیوں کہ ان کا چیف جسٹس رہنا کسی طور پر ادارے اور قوم کے مفاد میں نہیں تھا۔

یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ میں ریاض اختر کے چیف جسٹس بننے پر استعفیٰ دینے کی تیاری کے باوجود مستعفی نہیں ہوا۔ اس سارے عرصہ کے دوران ریاض اختر مستقل دباؤ میں رہا اور بالآخر میری ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی فارغ ہوگیا۔ یہاں یہ آئینی پوزیشن بھی واضح کروں کہ آئین کے تحت استعفیٰ یا برطرفی بھی ریٹائرمنٹ کے مترادف ہوتا ہے اور استعفیٰ دینے والا ریٹائرڈ تصور ہوتا ہے اور ان تمام مراعات اور حقوق کا مستحق ہوتا ہے جس کا ایک ریٹائرڈ جج مستحق ہوتا ہے۔

میرے قائم مقام چیف جسٹس بننے کے بعد عدالتی سربراہوں کے بورڈ میں میرا نام درج کیا گیا، لیکن خواجہ شہاد احمد اور جسٹس محمد اعظم خان نے مٹوا دیا، یہ ان کے اس ساری جعلی کارروائی میں شامل ہونے کی دلیل ہے جو ریاض اختر چوہدری نے میرے خلاف رچائی تھی، جبکہ ان لوگوں کا سپریم کورٹ میں چیف جسٹس اور جج ہونا میری وجہ سے ہی ممکن بنا تھا۔ وگرنہ ریاض اختر صاحب نے چوہدری اعظم صاحب کو ایڈہاک جج سپریم کورٹ کے طور پر کلرکوں کے کمرے میں بٹھایا تھا۔ اس بورڈ میں میرا نام نہ ہونے سے مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن سپریم کورٹ کی تاریخ میں یہ عرصہ بدوں سربراہ کے رکھنے کے سپریم کورٹ کے لیے ایک سوالیہ نشان ہے کہ 13 اپریل 2010 سے 12 مئی 2010 تک سپریم کورٹ کا چیف جسٹس یا قائم مقام چیف جسٹس کون تھا؟ جبکہ ریاض اختر 13 اپریل سے معطل اور 6 مئی سے مستعفی ہو گیا اور میں قائم مقام چیف جسٹس تھا۔ اس سے حقیقت تو نہیں بدلتی لیکن ذہنی دیوالیہ پن کی عکاسی ضرور ہوتی ہے جو سپریم کورٹ کے اوپر ایک بدنما دھبہ ہے۔

ججوں کے طرزِ عمل میں دباؤ یا سفارش

جج پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا جب تک جج کا اپنا طرزِ عمل ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اس پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں آجائے یا جج کی اپنی خواہشات اتنی وسیع ہوں کہ خود مفاد لے جس کے لیے دینا بھی پڑتا ہے۔ جج بننے سے پہلے جن لوگوں کے ساتھ تعلقات اور بے تکلفی ہوتی ہے، وہ بہرحال اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ اپنی بات کرسکیں گو کہ منوانے کی پوزیشن میں پھر بھی نہیں ہوتے۔ میرے

چیف جسٹس بننے کے دوران پاکستان میں فوج کی حکومت تھی اور فوج تقریباً[175] زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھی۔ ہمارے ایک جج صاحب تو فوجی ایجنسیوں سے اتنے مرعوب تھے کہ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا اگر ان کے دروازے کے سامنے کوئی فوجی جوتا رکھا جائے وہ اس کو دیکھ کر بھی سیدھے ہو جائیں گے۔ میرے ساتھ کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس پر کہا جائے کسی نے دباؤ ڈالا ہے یا دباؤ ڈال کر فیصلہ کروانا چاہا ہے حالاں کہ میں اکثر FIU,ISI,MI کے خلاف حبس بے جا کے مقدمات سنتا رہا۔ اور اس کے علاوہ ایسے مقدمات بھی جس میں فوج کا بالواسطہ تعلق بھی ہوتا تھا۔ اس لیے میری پختہ رائے ہے کہ اگر جج کا طرزِ عمل خود غلط نہ ہو تو نہ تو اس کو کوئی بلیک میل کرسکتا ہے نہ ہی دباؤ ڈال سکتا ہے۔ جو فوجی افسر کسی سازش میں شامل نہیں ہوتا اور اپنی رائے رکھتا ہے، وہ بہت معقول اور روشن خیال ہوتا ہے۔ سوائے مشرف کے دور کے، مجھے منصفی کے 18 سالہ دور میں کبھی کسی فوجی ایجنسی کے افسر نے کوئی دباؤ یا کام کرنے کا نہیں کہا بلکہ عدالتی احکامات کی بھرپور تعمیل اور تعاون کیا۔ جو جج خود سیاست دانوں، بیوروکریسی یا فوجی ایجنسیوں سے فائدہ چاہے، تو فائدہ دینا بھی پڑتا ہے۔ ایک بار اگر کوئی اس ٹریپ میں آ گیا، وہ کبھی آزاد نہیں ہوسکتا، وگرنہ سیاست دان کبھی ہمت نہیں کرتے اور فوجی اپنی ٹریننگ کے پس منظر میں خود کبھی مداخلت نہیں کرتے۔ انتظامی سطح پر ان کا اثر رسوخ بہرحال موجود رہتا ہے۔

میرے پاس دو تین مقدمات اور انتظامی امور میں کچھ لوگ حسب منشا فیصلہ چاہتے تھے مگر ایسا نہ ہونے پر انہوں نے بُرا بھی نہیں مانا۔ مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے کسٹوڈین جائیداد متروکہ، خواجہ نظیر احمد قادری کو نوکری سے نکال دیا گیا تو انہوں نے اس کے خلاف رِٹ کی۔ میرے پاس اس سلسلے میں سید ممتاز گیلانی مرحوم (جو اس وقت سردار عبدالقیوم صاحب کے دست راست تھے) سردار عبدالقیوم صاحب کا پیغام لے کر آئے کہ قادری کو بحال نہیں ہونا چاہیے۔ صدر ریاست سردار انور کا پولیٹکل سیکریٹری، صدر صاحب کا یہی پیغام لے کر آیا تھا۔ اس وقت کے ایک بڑے فوجی جنرل نے بھی سفارش کی لیکن ویسا نہیں ہوسکا کیوں کہ عدلیہ کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ عتیق کمیشن کے کچھ کیسز میں اثر انداز ہونے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت کے وزیر قانون اور سیکریٹری قانون کا ایک کیس تھا جس

میں اثر انداز ہونے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح آئی ایس آئی کے خلاف ایک شخص کو قتل کیے جانے کے کیس میں فیور چاہی گئی لیکن نہیں ہوسکا۔ الغرض یہ دباؤ حکومت کا ہو یا ماحول کا، اگر جج خود مضبوط ہو تو کوئی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے واضح پیغام ہونا چاہیے کہ جج بکنے یا جھکنے والا نہیں تو کوئی ہمت بھی نہیں کرتا۔ ایسے طرزِ عمل پر مخالف بھی حامی لگتے ہیں۔

استعفوں کی کہانی

میں مزاجاً اختلاف پسند (Non Conformmist) رہا ہوں، مطلب یہ کہ جہاں خیالات یا حالات مزاج کے مطابق نہ ہوں وہاں اختلاف یا انکار کرنا میری طبیعت میں شامل رہا ہے۔ اسی وجہ سے زندگی بھر متنازع ضرور رہا لیکن میرا وتیرہ رہا کہ اپنی بات یا تو منوائی، وگرنہ غلط کاری اور اپنے اصولوں کے خلاف بات نہیں مانی۔ اکثر لوگ مجھے پنگا لینے والا کہہ کر مجھ سے خائف یا دُور رہتے تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں سیاسی زندگی کے دوران 1972 میں جب جماعت اسلامی، جس کے ساتھ میں وابستہ تھا، نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس پر بہت احتجاج کیا کہ جماعت کو قومی مفاد میں الیکشن میں حصہ نہیں لینا چاہیے لیکن علی گیلانی اور قاری سیف الدین صاحب نے مجھے شدید تنبیہ کی کہ یہ تنظیم کا فیصلہ ہے۔ اس پر میں نے جماعت کے اخبار ترجمان الحق سے استعفیٰ دے دیا۔

میری عملی زندگی میں کئی ایسے مقام آئے جہاں مجھے اپنے ضمیر اور حالات کے تقاضوں میں مصلحت اور مصالحت کے مطابق چلنے میں دشواری پیش آئی۔ الحمدللہ کبھی ایسا کام نہیں کیا جو میرے ضمیر اور فلاح عام کے خلاف ہو۔ وکالت شروع کرنے کے بعد جب مجھے مقابلے کے امتحان کے بعد جموں و کشمیر حکومت کے محکمہ قانون میں Assistant Legal Remembrancer کے طور پر ٹرانسلیشن سیل میں لگایا گیا تو محض تین چار ماہ کے بعد مستعفی ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے محکمہ کے سیکریٹری نے دو تین روز کے دوران 10/12 سے زائد قوانین کو یکے بعد دیگرے ترجمہ کے لیے دیئے۔ میں نے اسی ترتیب سے کام کرنا شروع کیا جس ترتیب سے دیا گیا تھا۔ لیکن سیکریٹری کی خواہش بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ آخری حکم کی

تعمیل کو فوقیت دینا چاہتے تھے۔ جبکہ اس نے ایسا کہا نہیں تھا، وگرنہ میں ویسا ہی کرتا کیوں کہ انتظامی معاملات میں ویسا کرنا ناگزیر تھا۔ جب مجھ سے اس نے آخری دو قوانین کا ترجمہ مانگا تو میں نے کہا کہ میں تو ابھی پہلے چھے تک پہنچا ہوں۔ اس پر وہ بہت ناراض ہوا اور چیف سیکریٹری سے شکایت کی جس کے بلانے پر میں اس کے آفس میں گیا۔ اس نے مجھے بہت ڈانٹ پلائی اور برا بھلا کہا۔ میں نے چیف سیکریٹری کو برجستہ جواب دیا کہ سیکریٹری نے مجھے ویسا کرنے کو کہا نہیں تھا، اس لیے میں نے اپنی سمجھ کے مطابق کام کیا ہے، اس لیے میری غلطی نہیں ہے۔ میں نے اس کو کہا کہ آپ لوگوں کی زبان آپ کے مرتبے سے مطابقت نہیں رکھتی اور نا قابل برداشت ہے۔ میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا مجھے اختیار حاصل ہے، اس لیے میں یہ ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر میں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد چیف سیکریٹری نے سیکریٹری قانون غلام شاہ مرحوم کو سرینگر میری رہائش پر منانے بھیجا لیکن میں اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ میرے ساتھ کے تین لوگ ریاستی اور دو سیکریٹری کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

دوسرے واقعات آزاد کشمیر منتقلی کے بعد کے ہیں۔ 1990 میں جب میں ایڈووکیٹ جنرل آزاد کشمیر تھا، اس وقت کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا کیوں کہ انہوں نے میری قانونی رائے کے برعکس دو حلقوں میں الیکشن لڑا جو غلط تھا۔ جب ان کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ ہوا، میں نے اس کی پیروی کی بجائے استعفیٰ دے دیا۔ کیوں کہ میں ان کو پہلے ہی یہ کہہ چکا تھا۔

جب مجھے ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی اضافی ذمہ داری دی گئی تو ایک روز عسکری/مجاہد تنظیموں کے کچھ لوگ میرے پاس یہ درخواست لے کر آئے کہ ان کو یونیورسٹی کیمپس گراونڈ میں تین روزہ تربیتی کورس کے لیے اجازت دی جائے، میں نے معذرت کی۔ اس پر آئی ایس آئی کے ایک کرنل کے ہمراہ یہ لوگ دوبارہ آئے، میں نے دوبارہ معذرت کی۔ اس کے بعد صدر ریاست سردار محمد ابراہیم خان مرحوم نے مجھے ایسا کرنے کو کہا۔ میں نے اس پر بھی معذرت کی۔

پھر صدر اور وزیر اعظم نے ایک مشترکہ میٹنگ میں مجھے بھی بلایا جہاں آئی ایس آئی کے وہی کرنل موجود تھے۔ میں نے ان کو کہا کہ یونیورسٹی کے گراونڈ کی چاروں طرف کلاسز لگتی ہیں۔ ہاسٹل ہیں۔ باغیچہ میں طرح طرح کے پودے لگے ہیں۔ تعلیمی ماحول اس ساری مشق سے متاثر ہوگا اور 4/5 ہزار کے قریب شرکاء یونیورسٹی کو تین سال پیچھے دھکیل دیں گے جو بڑی مشکل سے بنایا گیا ہے۔ لیکن وزیر اعظم بیرسٹر سلطان محمود اور سردار ابراہیم خان نے ایک نہ مانی۔ میں نے ان کی بات رکھتے ہوئے کہا کہ اچھا جولائی میں چھٹیاں ہونے والی ہیں، اس دوران اس شرط پر گراؤنڈ استعمال کرلیں کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو۔ یہ بات بھی انہوں نے نہ مانی جس پر میں معذرت کر کے نکل آیا۔ اگلے روز ایک حکومتی نوٹیفیکیشن میرے نوٹس میں لایا گیا جس کے تحت یونیورسٹی میں تین دن کی چھٹی کر دی گئی اور متعلقہ تنظیموں کو وہاں سرگرمیاں شروع کرنے کی اجازت دی گئی۔ میں نے یہی نوٹیفکیشن ساتھ رکھ کر ایک تفصیلی خط کے ذریعہ صدر ریاست کو جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہوتے ہیں، اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ اگر انسان حالات کا مقابلہ نہیں کرسکتا تو صرف دو صورتیں باقی رہتی ہیں یا ان سے سمجھوتہ کر لے یا الگ ہو جائے۔ میں نے الگ ہونے کا باوقار فیصلہ کرلیا۔ جماعت اسلامی کے مقامی امیر نے اجازت نہ دینے پر مجھ پر الزام لگایا کہ ''گیلانی صاحب کے ذہن پر ابھی تک ہندوستانی سوچ حاوی ہے۔'' مجھے اس بات کا بہت دکھ ہوا۔ بہرحال یہ پاکستانی سیاست کا کلچر ہے۔

ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے ہی مجھے چیف الیکشن کمشنر آزاد کشمیر کے طور پر اضافی چارج دیا گیا۔ میں نے اس دوران اصلاحات کا عمل شروع کرنے کا فیصلہ کیا جس کے تحت ووٹرلسٹوں کی جدید تیاری بذریعہ کمپیوٹر اور شناختی کارڈ، حلقہ بندیوں کا ازسرنو تعین، مہاجرین نشستوں پر ریاستی باشندہ سرٹیفکیٹ کی بنا پر ووٹروں کا اندراج، 1990 کے بعد آنے والے مہاجرین اور مجاہدین جو یہاں آباد ہو گئے کو بطور ووٹر درج کرنا وغیرہ۔ میں نے اس سلسلہ میں ساری سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لینے کی خاطر ان کا اجلاس بھی بلایا۔ اس میں سب جماعتوں کے سربراہ یا ان کے سیکریٹری جنرل شامل ہوئے۔ سب نے میری تجاویز سے اتفاق کر کے حتمی فیصلوں پر دستخط ثبت کر دیئے۔ تین چار دن کے بعد ایک روز مجھے

سیکریٹری الیکشن کمیشن شیخ محمد نسیم نے فون کر کے بتایا کہ آزاد کشمیر اسمبلی نے[175] میرے اقدامات کی مذمت کرتے ہوئے الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کی متفقہ قرارداد پاس کر لی ہے۔ یہ اس وقت کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان اور چوہدری عبدالمجید جو قائد حزب اختلاف تھے، کی ملی بھگت سے ہوا تھا۔ غصہ انہیں دو باتوں پر تھا، اوّل یہ کہ میں نے 1990 کے بعد آنے والے کشمیری مہاجرین کو بھی ووٹ کا حق دیا جو یہ لوگ اپنے آپ کے لیے چیلنج سمجھتے تھے کیوں کہ ہر حلقہ کا توازن اس سے متاثر ہوتا تھا، جو ان کے مفاد کے مغائر تھا۔ دوسرا یہ کہ ان لوگوں نے مہاجرین کے حلقوں میں غیر ریاستی باشندوں اور آزاد کشمیر میں بسنے والے اپنی اپنی برادری کے لوگوں کے ووٹ درج کرائے تھے جن سے طاقت کا توازن بگڑ رہا تھا۔ سردار سکندر حیات خان کو میرے خلاف یہ شکایت بھی تھی کہ میں نے چیف جسٹس ہائی کورٹ کی حیثیت سے ان کے خلاف اسمبلی کی ممبرشپ سے نااہلی کی ایک رٹ سماعت کے لیے منظور کی تھی جس کے بارے میں انہوں نے فون کر کے بھی کہا تھا کہ اس کا خیال رکھیں۔ اس رِٹ نے بالآخر خارج ہی ہونا تھا لیکن اس نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کروا کر معاملہ وہاں التوا میں ڈال دیا۔ قرارداد موصول ہونے پر میں نے صدر ریاست جو اس وقت جنرل محمد انور خان ہوا کرتے تھے، کو 12/13 صفحات پر مشتمل ایک خط لکھا جس میں ساری روئیداد لکھ کر احتجاجاً استعفیٰ دے دیا کہ اگر حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف اصلاحات پر اتفاق کرنے کے بعد ایسا کرتے ہیں تو میں یہ ذمہ داری نبھانے سے معذرت خواہ ہوں۔ جنرل انور کی کوشش تھی کہ میں اس پر شدید ردِعمل کروں۔ لیکن ایسا کرنے سے الیکشن کا عمل متاثر ہونے کے علاوہ حکومت سے تعاون نہ ملنے کی صورت میں میری پوزیشن خراب ہوسکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اس وقت میں ڈٹ جاتا سکندر حیات کی حکومت کو دفعہ 56 کے تحت برطرف کیا جاتا۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا، جبکہ صدر اور باقی کچھ لوگوں کی خواہش تھی۔ اس کے بعد ان سیاست دانوں کی شرائط پر ہی ریاض اختر چوہدری صاحب کو چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا۔ میرے خیال میں یہ سارا ڈرامہ M.I کے مقامی بریگیڈیئر کی ملی بھگت سے رچایا گیا تھا جس کو بعد کے واقعات درست ثابت کرتے ہیں۔

آخری بار اس وقت استعفیٰ تحریر کرنے کے باوجود نہ بھیج سکا جب مجھ سے سات سال جونیئر شخص کو چیف جسٹس سپریم کورٹ بنا دیا گیا۔ مجھے والدین، گھر کے بچے، بچیوں اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس ناانصافی کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے، بھاگنے میں عافیت نہیں ہے۔ میں رخصت لے کر حج پر چلا گیا اور واپس آ کر ڈٹ کر مقابلہ کیا جب آزاد کشمیر حکومت اور حکومت پاکستان سے انصاف نہ ملا جس پر اس وقت جنرل مشرف کی وجہ سے فوجی ایجنسیاں قابض تھیں تو میں نے سپریم کورٹ پاکستان میں پٹیشن فائل کر دی جو ایسے حالات میں ایک غیر معمولی اور انقلابی قدم تھا۔ پاکستان بھر کے قانونی، سیاسی اور فوجی حلقے انگشت بدنداں رہ گئے کہ یہ راز بین الاقوامی سطح پر کیوں فاش کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ثابت قدمی عطا کی اور اس کی مہربانی کی وجہ سے آزاد کشمیر حکومت نے جس کے سربراہ راجہ فاروق حیدر اور قائم مقام صدر شاہ غلام قادر تھے، اس وقت کے چیف جسٹس ریاض اختر چوہدری کے خلاف بدمعاملگی پر مبنی ریفرنس فائل کیا۔ اس کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا لیکن انہوں نے حکومت پاکستان کی مدد سے سابقہ تاریخ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی استعفیٰ دے کر ریٹائر منٹ لے لی۔ اس کی تفصیل کسی اور جگہ درج ہے۔ اگر میں نے استعفیٰ دے دیا ہوتا تو ریاض اختر کی بچگانہ حرکتوں کا مقابلہ اور اس کی برطرفی کا کوئی امکان نہ ہوتا جس سے آزاد کشمیر کی عدلیہ برباد ہو جاتی۔ اگر مجھے جسٹس ابراہیم ضیا اور جسٹس غلام مصطفیٰ مغل کی معاونت میسر نہ آتی تو میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ راجہ فاروق حیدر خان کو ہر لحاظ سے موافق حالات میسر آئے جس کی وجہ سے یہ کام ممکن ہوا۔

آزاد کشمیر عدلیہ ملک بھر میں اہلیت، دیانت، جرأت اور غیر جانبداری میں ممتاز تھی لیکن بدقسمتی سے ملک عبدالمجید اور سردار سید محمد کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ معیار قائم نہیں رکھ سکی۔ محدود علاقہ ہونے کی وجہ سے عدلیہ میں Personality clash ہمیشہ سے رہا، بالخصوص چوہدری رحیم داد مرحوم اور محمد یوسف صراف مرحوم کے عرصہ کے دوران، لیکن پیشہ ورانہ دیانت ہمیشہ قائم رہی جو 2004 کے بعد زوال پذیر ہو گئی۔ ججز کے سیاستدانوں بالخصوص حکومتی سیاستدانوں اور بیوروکریسی سے روابط بڑھ گئے۔ کچھ ججز حکومتی اور حزب اختلاف کے سیاست دانوں کے مشیر اور ان کے درمیان مفاہمت بڑھانے میں فخر

محسوس کرنے لگے ہیں۔ اہلیت کے معیار پر بھی سمجھوتہ ہونے لگا ہے۔ برادریوں اور علاقوں کی نسبت کے حوالے سے نوازشیں نچھاور کرنے کی شکایات زبان زد عام ہوتی جا رہی ہیں۔ ججوں کا وکلاء تنظیموں کے الیکشنز کے دوران مداخلت اور وکلاء کے اندر برادری، علاقائی اور دیگر مفادات کی بنیاد پر گروپ بندی کی شکایات بھی عام ہیں جس وجہ سے وکلاء کا پیشہ ورانہ معیار متاثر ہو رہا ہے اور معیاری وکیل ناپید ہو رہے ہیں جو جج بننے کے شوق میں ججوں کی غلط کاریوں کی پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ریاض اختر صاحب کی باقیات کے بعد عدلیہ کی توقیر بحال ہونا شروع ہو جائے گی۔ اگر عدلیہ کی نئی قیادت نے عدلیہ میں Intake میں جرأت کا مظاہرہ کیا اور خود بھی ویسی حرکتیں نہ کیں۔

میں کئی سالوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہائی کورٹ کی انتظامی صلاحیت مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے سربراہ، افتادِ طبع، مصلحت، مصالحت، سیاست دانوں، زورآوروں، رشتہ داروں، برادری اور جتھہ بندوں کو ممنون کرنے میں بدنام ہو رہے ہیں۔ ہائی کورٹ کی انتظامی گرفت کمزور جبکہ سپریم کورٹ ماتحت عدلیہ پر حاوی ہوتی جا رہی ہے جس کا راستہ ہموار کیا جا رہا ہے۔ حالاں کہ سپریم کورٹ کے پاس نہ تو انتظامی اختیارات ہیں اور نہ ہی سپریم کورٹ، پاکستان کی طرح کے (3)184، اس کے باوجود یہ اختیارات کا ناجائز استعمال کرتی ہے، براہِ راست احکامات جاری کرتی ہے۔ ماتحت عدلیہ معائنہ کرتی ہے بلکہ ہائی کورٹ کے ججز کے احکامات اور خود ان کے خلاف تادیبی کارروائی بھی۔ یہ افسوس ناک ہے۔ یہ سب کچھ مہم جوئی اور عدالت عالیہ کے چیف جسٹس کی انتظامی گرفت کی کمزوری کی وجہ سے ہو رہا ہے جبکہ اس کے انتظامی، آئینی اور قانونی اختیارات بہت وسیع ہیں جن سے سپریم کورٹ کو رشک اور اس پر حاوی ہونے کی مہم جوئی ہوتی رہتی ہے جس وجہ سے اس کی حیثیت متاثر ہو گئی ہے۔ میں دیانت داری سے محسوس کرتا ہوں کہ ماتحت عدلیہ کے انتظامی اختیارات سپریم کورٹ کو ہی سونپ دیئے جائیں جس سے یہ دوعملی ختم ہو جائے گی اور اس چھوٹے سے علاقے میں عدلیہ صرف ایک ادارے کے کنٹرول میں آ جائے گی۔ بنگلہ دیش کی طرز پر سپریم کورٹ کے دو ڈویژن بنائے جائیں۔ ایک کا نام Appellate Division of اور دوسرے کا نام High Court Division of Supreme Court

Supreme Court۔ان میں تقرریاں جیوڈیشل بورڈ کے ذریعہ ہوں جس میں سارے ججز، بار کونسل کے نمائندے، حکومت آزاد کشمیر اور کشمیر کونسل کے نمائندے بھی شامل ہوں جن کی سفارش پر صدر آزاد کشمیر ججوں کی تقرری کرے۔ بہت ہی اچھا ہوگا اگر متوقع ججوں کو کسی Testing Process سے گزرنا پڑے جس میں ان کی پلیڈنگز اور دلائل کا معیار بھی زیر بحث آنا چاہیے اور اس کا نتیجہ پبلک ہونا چاہیے۔اس سے بھی عمدہ عمل یہ ہوگا کہ پاکستان بھر میں ججز کا تبادلہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں ہو اور چیف جسٹس ہمیشہ دوسرے صوبے کا ہونا چاہیے تاکہ عدلیہ مقامی اثر ورسوخ سے پاک ہوجائے۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوتا ہے جبکہ پاکستان کے آئین میں اس کی گنجائش ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہو رہا۔

اس کے ہی متعلق دو اہم آئینی معاملات میں سے ایک چیف جسٹس سپریم کورٹ اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین ہونا ہے۔آئین کی دفعہ 32 کے تحت آزاد کشمیر کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان مقرر ہے جبکہ آزاد کشمیر کی حکومت نے ایک قانون کے تحت ایک اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل دی ہے جس کا چیئرمین چیف جسٹس آزاد کشمیر ہے۔ چیف جسٹس صاحبان کس طرح یہ عہدہ قبول کرتے ہیں جبکہ آئین میں واضح طور پر یہ حکومت پاکستان اور قومی اسمبلی کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔اس طرح کسی جج کے خلاف شکایت صدر یا سپریم جیوڈیشل کونسل کو تحقیقات کے لیے بھیجنا ہوتا ہے، جس کی رپورٹ پر ہی سپریم جیوڈیشل کونسل کارروائی کرسکتی ہے، لیکن اس کو از خود کارروائی کرنے کا کوئی اختیار نہیں، نہ ہی کسی جج کو طلب کرسکتی ہے۔ تاہم، اگر حکومت کو بھیجنے سے پہلے سپریم جیوڈیشل کونسل کو اطمینان کرنے کا اختیار دیا جائے تو بہتر ہے۔